خصوصی شمارہ
مرزا غالب

نقشِ نو

۲۰۱۹ء ۔ ۲۰۲۰ء

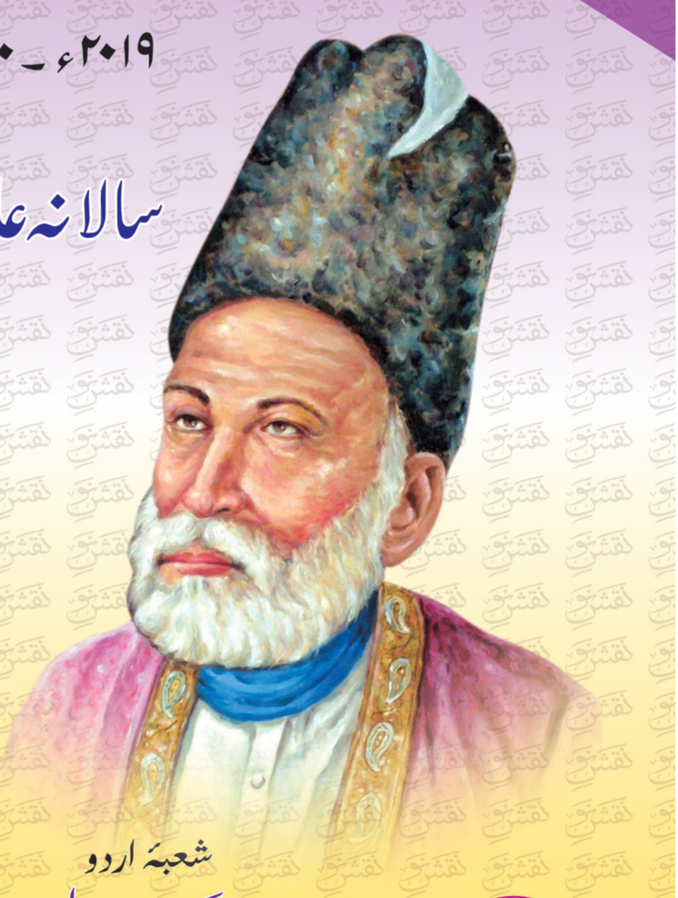

سالانہ عالمی اردو جریدہ

شعبۂ اردو
حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، پریاگراج
الہ آباد یونیورسٹی

نقشِ نو

سالانہ عالمی جریدہ

شمارہ دوازدہم

۲۰۱۹ء۔۲۰۲۰ء

خصوصی شمارہ

غالبؔ اور عہدِ غالبؔ

مدیر: ناصحہ عثمانی

معاون مدیر: زرینہ بیگم

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلس ڈگری کالج

الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج، الہ آباد، یو۔پی۔انڈیا

"نقشِ نو" سالانہ عالمی جریدہ۔شمارہ دوازدہم

سرپرست: مسز تزئین احسان اللہ　　**نگراں:** ڈاکٹر یوسفہ نفیس

مجلسِ مشاورت:

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی

ڈاکٹر ریحانہ طارق

ڈاکٹر مامون ایمن (نیویارک)

ڈاکٹر عارف نقوی (جرمنی)

ڈاکٹر محمد آصف علی (ماریشس)

مجلسِ ادارت:

اعزازی مدیر پروفیسر عبدالحق

مدیر مسز ناصحہ عثمانی

معاون مدیر مسز زرینہ بیگم

معاونین:

ڈاکٹر شبانہ عزیز　　ڈاکٹر ندرت محمود

ڈاکٹر فرح ہاشم　　ڈاکٹر کائنات انصاری

کمپیوٹر کمپوزنگ: شاذیہ غلام انصاری

ناشر: شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، نوراللہ روڈ، الہ آباد۔ یو۔ پی۔ انڈیا

فون نمبر: 0532-2656526　**موبائل نمبر:** 9559258741

ای میل: naqshenauurdu@gmail.com

naseha29@yahoo.co.in

ISSN 2320-3781 Naqsh-E-Nau

قیمت: اندرونِ ملک 100 روپئے، بیرون ملک 10 ڈالر (ڈاک خرچ الگ)

"نقشِ نو" کے مشمولات میں ظاہر کردہ نفسِ مضمون سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

(جملہ حقوق بحقِ شعبۂ اردو، حمدیہ گرلس ڈگری کالج محفوظ ہیں۔)

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
۱	اپنی بات	مسز ناصحہ عثمانی	5
۲	فردِ فرید غالبؔ: ایک مختصر نفسیاتی جائزہ	ڈاکٹر مامون ایمن	7
۳	۱۸۵۷ء اور غالبؔ کے خطوط	پروفیسر اسلم جمشید پوری	22
۴	حالیؔ بحیثیت محققِ غالبؔ (''یادگار غالبؔ'' کے حوالے سے)	پروفیسر شبنم حمید	32
۵	مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اور الہ آباد	پروفیسر صالحہ رشید	42
۶	موجودہ پُر آشوب دور کے پس منظر میں کلام غالبؔ پر نظر ثانی	پروفیسر یوسف نفیس	61
۷	غالبؔ کے تلامذۂ میرٹھ: اسمٰعیل میرٹھی کا تصور علم	ڈاکٹر فوزیہ بانو	68
۸	شخصی مرثیہ گوئی اور غالبؔ	ڈاکٹر لئیق رضوی	79
۹	مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ: ظرافت کے آئینہ میں	ڈاکٹر بشریٰ بانو	88
۱۰	مرزا غالبؔ اور دبستانِ میرٹھ کا ادبی شعور نقد	ڈاکٹر ابراہیم افسر	102
۱۱	تفہیم غالب اور شمس رحمٰن فاروقی	ڈاکٹر ارشد جمیل	140
۱۲	غالبؔ کی آفاقیت	ڈاکٹر عبدالحفیظ	149

۱۳	کلامِ غالبؔ میں ’’تعمیر گھر‘‘ کا تصور	مسز زرینہ بیگم	159
۱۴	غالبؔ کی فارسی مثنوی ’’سرمۂ بینش‘‘	ڈاکٹر شبانہ عزیز	170
۱۵	زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم	ڈاکٹر محمد شاہد	181
۱۶	غالبؔ بحیثیت نثر نگار	چودھری امتیاز احمد	193
۱۷	’کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور‘	شاذیہ غلام انصاری	203

اپنی بات

موجودہ دور ایک تلاطم خیز دور ہے۔ انسانیت ہراساں ہے۔ ایک وائرس نے تمام عالم کو ہجوم غم ہائے روزگار میں ایسا الجھایا ہے کہ اس سے باہر آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی کاروبار دنیا اور ضروریات زندگی نے انسان کی قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔ گزشتہ کئی مہینوں سے انسانیت درد وغم کے طوفان بلاخیز سے دو چار ہے۔ کووڈ۔۱۹ کی تباہ کاریوں نے انسانیت کو ہلا کے رکھا ہے بلکہ اس کے مابعد اثرات بھی کچھ کم درد آمیز نہیں۔ سینکڑوں میلوں کی دوری پیدل طے کرنے والے مزدوروں کی سڑک حادثات میں موت، بھوک اور بے روزگاری سے تنگ آکر روز افزوں خودکشیوں کی تعداد میں اضافہ، روتے بلکھتے معصوم بچے اور عورتیں، یتیم اور بے سہارا ہوتے بچے اور سونی ہوتی گودیں یہ وہ تلخ حقائق ہیں جن سے ہم روگردانی نہیں کر سکتے ہیں لیکن بہر حال جو بھی حالات ہیں ان سے نبرد آزما ہونے کی طاقت بھی اوپر والا ہی دیتا ہے کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے تو۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

چنانچہ ان دشواریوں کے درمیان حضرت انسان کو راہ نکالنے میں دیر نہیں لگتی۔ آدم کو جب جنّت سے نکالا گیا تو اس نے دنیا کو جنّت بنانے کا عزم اٹھا لیا اب جب دنیا میں بھی تباہیاں اور تباہ کاریاں انسان کو خون کے آنسو رلا رہی تو ایک بار پھر حضرت انسان نے اپنے لئے راہیں نکال لیں۔ اب یہ برقی لہریں بن کر سامنے آئیں کیونکہ حضرت انسان کی فطرت میں اضطرابیت ہے، جمود اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ چنانچہ آج کی

برق رفتار زندگی میں انفارمیشن ٹکنالوجی نے دنیا کو بیک وقت ایک نقطہ پر بھی لا دیا اور تمام عالم پر پھیلا بھی دیا۔ مرکز ان علم و دانش نے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور زبان و ادب نے بھی اس راستوں کو اپنایا۔ جن کی انگلیوں نے کبھی کمپیوٹر کی اسکرین کو چھوا بھی نہیں تھا وہ بلا قید عمر آن لائن پروگرام میں شمولیت درج کروا رہے ہیں۔ سماجی دوری نے ایک طرف تو انسان انسان میں دوری پیدا کی دوسری طرف سات سمندر پار کے لوگوں کے علم و دانش و تجربات کا فیس بُک لائیو، یوٹیوب لائیو، گوگل میٹ، زوم میٹ لائیو کے ذریعہ ہم ان لوگون کے مقابل آئے، نئے رابطے پیدا ہوئے جن سے ملنے کے بارے میں شاید کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے ان سے براہ راست متکلم ہونے کا موقع ملا۔ کیونکہ ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہونے کے بعد پھر 'نقش نو' کے ۲۰۱۹ء ۔ ۲۰۲۰ء کے شمارے کی طباعت یاد آئی جو کہ 'غالبؔ اور عہد غالبؔ' کا خصوصی شمارہ ہے۔ اب جبکہ غالبؔ نے مشکلوں کے آسان ہونے کا پیغام دے ہی دیا تو شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ غالبؔ کے فن و شاعری سے جڑے ۱۶ موضوعات اس شمارے کی زینت بنے ہیں۔ ہم ان سبھی قلم کاروں کے ممنون و مشکور ہیں جن کے قلمی تعاون نے اس دور پُر آشوب میں بھی ہم 'نقش نو' کو طبع کروا سکے۔

ناصحہ عثمانی

فردِفرید غالبؔ:

ایک مختصر نفسیاتی جائزہ

بہ حیثیتِ فردِ فرید، غالبؔ کی شخصیت کے حوالہِ سے، اِس مختصر نفسیاتی جائزہ میں ''وجود، انفرادیت، اِجتماعیت، یکتائی'' نسبتاً زیادہ نمایاں اِنسلاکی عناصر ہیں۔

غالبؔ کا شجرہِ نسب فَریدوں کے سب سے بڑے بیٹے، توران سے مِلتا ہے، یوں وہ ایک سلجوقی مغل ہے۔ مرزا قوقان بیگ خان کا پوتا، مرزا عبداللہ خان کا بیٹا، مرزا اسداللہ خاں، المتخلّص بہ اسدؔ/غالبؔ، ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہُوا تھا، اور ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں فوت ہُوا تھا۔

عبداللہ بیگ ایک جنگ میں مارا گیا، تو اس کے ایک چھوٹے بھائی، مرزا نصراللہ بیگ خان نے غالبؔ کی کفالت اپنے ذمّہِ لے لی۔ جلد ہی نصراللہ بیگ کی موت پر، یہ ذمّہِ داری اس کے نانا خواجہ غلام حسین خان کماں دان نے سنبھالی، جو فاروقی النّسل تھے۔

غالبؔ کو اپنے دادھیال اور ناھیال دونوں پر فخر تھا کہ وہ دونوں خاندان دولت اور شوکت میں نام وَر تھے۔ بعدہٗ اس خاندان کے کئی افراد، غالبؔ سے نِسبت کے باعث، شہرت اور اِفتخار کا باعث ٹھہرے۔

غالبؔ کی شادی تیرہ برس کی عمر میں، جھرکا اور لوہارو کے نوّاب احمد بخش خان کی بیٹی، اُمراؤ بیگم سے ہوئی تھی۔ اُمراؤ بیگم سے سات بچّے ہُوئے تھے، جو بہت کم عمری ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ بہ وجوہ، غالبؔ کی شادی کبھی خوشی کا باعث نہ بَنی تھی۔

تُرکوں میں یہ رسمِ تھی کہ باپ کی وفات پر، صِرف تلوار بیٹے کو مِلتی تھی، اور دیگر اَملاک بیٹی کو۔......غالبؔ نے سِپہ گری تجی، قلم تھاما اور صدیوں پرانی وہ رسم توڑی۔ یہ ایک بغاوت تھی۔ غالبؔ کو اس بغاوت کا شعوری اِحساس بھی تھا، اور اِعتراف بھی۔

سو پشت سے ہے پیشہِ آباء سِپہ گری
کچھ شاعری ذریعہِ عزّت نہیں مجھے

اس شعر کے دوسرے مصرِع میں لفظ ''نہیں'' اِنکار کے بجائے، اِقرار کا مفہوم ادا کرتا نظر آتا ہے، کہ غالبؔ کی شناخت تلوار نہیں، قلم ہے۔ شاعری ازل سے غالبؔ کی قسمت کی منزل تھی۔ قلم کی مجوّزہ شناخت، غالبؔ کو، وجود سے اِنفرادیت کی طرف لاتی ہے۔ شاعری کے حوالہِ سے، کیا قسمت ''غم'' ہے؟

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دِل بھی ، یارب! کئی دِیے ہوتے

جی نہیں، اس منفرد تمنّا کے باوجود، بے شمار غموں کے جلو میں، غالبؔ کے سِینہِ میں صِرف ایک ہی دِل رہا، جو صاحب دِل کے لِیے نہیں، زمانہِ کے لِیے دھڑکتا تھا۔ زمانہ اس صاحب دِل کی قربت کا متمنّی رہا، لیکن دُوری کی ایک خلیج کے ساتھ۔ وہ صاحب دِل، کئی چہروں والے زمانہِ کی فِطرت سے آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زمانہ ہمیشہ گہن کی زَد میں آنے والے چاند اور سورج پر تنقید کرتا ہے۔ زمانہ کبھی ستاروں کو بے وفائی پر مُوردِ الزام نہیں ٹھہراتا، کہ وہ گہن کی دسترس سے باہر ہیں۔ لہٰذا، وہ فِطرتِ زمانہ کو پیشِ نظر رکھتے ہُوئے، خود کو بے کس اور مجبور کہتا ہے، تاکہ غیروں کی نگاہوں کی شِدّتِ تنقید کم ہو۔

ہم کہاں کے دانا تھے، کِس ہُنر میں یکتا تھے
بے سبب ہُوا، غالبؔ! دشمن آسماں اپنا

غالبؔ کا یہ گِلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ وہ فن کے تپتے صحرا میں، خود کو شعلہ رُخ سورج کی باہوں میں اس طرح دیتا ہے کہ اس کا جسم جھلسانے والی شعاؤں میں تو نہائے، لیکن زمین پر اس کا سایہ نہ ہو، یعنی وجود ہی عدم ہو۔ بہ الفاظِ دیگر، فن کار اپنے فن سے لاتعلّق نظر آئے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

غالبؔ اس عمل سے خود کو چُھپانے میں ناکام ہے، کہ یہ عمل زندگی کرنے کے آداب میں ایک واضح خودفریبی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجوّزہ خودفریبی میں پردہ داری ہے۔ اس پردہ داری کے پس منظر میں، ایک روشن آئینہ ہے، وہ آئینہ جس میں چہرہ، پَرتو کے روبرو ضرور ہوتا ہے۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
مَیں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

......

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو وِیراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا

......

بے دادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر، اسدؔ!
جس دِل پہ ناز تھا مجھے، وہ دِل نہیں رہا

بے دادِ عشق سے نہ ڈرنا، ایک اِنفرادی بات ہے، اور دلِ نازاں کا نہ رہنا ایک اِجتماعی بات ہے، کہ کاروبارِ قلب ونظر میں یہ ایک معاملہ ہے۔ یوں غالبؔ اِجتماع میں بھی، اپنی اِنفرادی حیثیت برقرار رکھنے میں کام یاب ہے، اس اہتمام

کے ساتھ کہ وہ اپنے معاشرِہ سے کٹ کر رہنے کا تصوّر بھی نہ کرے۔ غالبؔ ’’جزو،کُل‘‘......’’قطرہ، دریا‘‘ کے ربطِ باہمی کا درک رکھتا ہے۔ وہ اس ربطِ باہمی کا معترف بھی ہے،اورنقیب بھی۔

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حَد سے گزرنا ہے، دَوا ہو جانا

......

قطرہ دریا میں جو مِل جائے،تو دریا ہو جائے
کام اچّھا ہے وہ جِس کا کہ مآل اچّھا ہے

......

گِلہ ہے شوق کو دِل میں بھی تنگیِ جاں کا
گہر میں محو ہُوا اِضطراب دریا کا

......

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

......

دِل میں پھر گِریہ نے اِک شور اُٹھایا، غالبؔ!
آہ، جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نِکلا

......

بیاں کیا کیجیے بے دادِ کاوش ہائے مِژگاں کی
کہ ہر اک قطرۂِ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

......

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا مَیں
مجموعہِ خیال ابھی فرد، فرد تھا

غالبؔ معاشرتی رشتوں، ناتوں سے رُوگردانی نہیں کرتا۔ وہ بیٹا بھی ہے، اور یتیم بھی۔ وہ بھتیجا بھی ہے، شوہر بھی ہے، اور داماد بھی۔ لہٰذا، اس کے چاروں طرف زندگی کے تجربات بھی ہیں، اور مشاہدات بھی۔ گھر میں، وہ ان بچّوں کا باپ ہے، جو اس کی گود میں نہ ہمک سکے، باہر وہ ایک باکمال شاعر ہے، جواری ہے، شرابی ہے، مقروض ہے، سائل ہے، فاعِل ہے، مفعول ہے۔ وہ صحن آشنا بھی ہے، چمن آشنا، محل آشنا، اور ویرانہ آشنا بھی۔ وہ نَشاط آشنا بھی ہے، اور الم آشنا بھی۔ وہ حیات آشنا بھی ہے، اور مرگ آشنا بھی۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا

وہ ذوقِ نظر کے حصول کے بعد، تسکین پر رونا عبث سمجھتا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ، کہ حورانِ خلد میں محبوبہ کی صورت ضرور مِلے۔ بہ الفاظِ دیگر، وہ دنیا کا منظر، عقبیٰ میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ماحول میں رُونما ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات اپنی شخصیت میں بھی اجاگر پاتا ہے، کہ اِنفرادیت بہ ہر حال اِجتماعیت سے مربوط ہے۔

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہِ یارب مجھے
سبحہ زاہد سے ہُوا ہے خندہ زیرِلب مجھے

......

آگے آتی تھی حالِ دِل پہ ہنسی
اب کِسی بات پر نہیں آتی

وہ ہنستا ہے تو وقار کے ساتھ، وہ روتا ہے تو ضبط کے ساتھ۔ غالبؔ کی یہ روش غیر معمولی نہ ہونے کے باوجود، مِثالی ضرور ہے۔ یہ روش اس کے لِیے معاشرِہ میں ترجیح اور تمئیز کا سامان فراہم کرتی ہے۔

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

مندرجہ ذیل شعر میں، قوافی کے ایک سقم کے باوجود، وہ برجستگی سے، ایک حقیقت کی وضاحت کرنے میں کام یاب ہے۔

بس کہ دشوار ہے، ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں اِنساں ہونا

یہ روش اِنفرادیت کے ساتھ ساتھ، اِجتماعیت کی قدروں کی عکّاسی بھی کرتی ہے، ایک نیا چہرہ، ایک نئے آئینہ سے محوِ گفتگو نظر آتا ہے۔

لازم نہیں کہ خِضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر مِلے

......

بندگی میں بھی، وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

یہی خود بینی غالبؔ کو اِجتماعیت میں بھی یکتائی کا درجہ دیتی ہے۔ لہٰذا، وہ اِجتماعیت میں، اِنفرادیت حاصل کرنے والے متقدمین کی خدمات کا معترف ہے۔ وہ بیدلؔ، صائبؔ، عُرفیؔ، نظیریؔ، اور ظہوریؔ کی تخلیقات اور اسالیب کے گُن گاتا ہے۔ وہ معتقدِ فنِّ میر ہے۔ وہ ان متقدمین کی تخلیقات، اسالیب، اور فنون کو "بزمِ رنگ و بو" کہتا ہے۔ وہ رنگ و بو کے اِکتسابات اور محاسن کا تحفّظ کرنا چاہتا ہے، لیکن کسی بھی صورت

میں، وہ خود کو اس بزم کی منزل کا مسافر نہیں گردانتا۔ ہاں، وہ اس بزم کی پارینگی کو عہدِ تازہ کے جھونکوں، رنگوں اور خوشبوؤں سے سجا کر، ماضی کو حال سے، اور حال کو مستقبل سے بہتر بنانے کی جستجو میں، مصروفِ نظر ہے۔ اس کے پاؤں میں ایک چکّر ہے، زنجیر نہیں۔

مانعِ دشت نوردی کوئی تحریر نہیں
ایک چکّر ہے مِرے پاؤں میں، زنجیر نہیں

کہنہ فنّی روایات سے جُزوی اِجتناب اور نئے راستوں کے تعارف سے، غالبؔ زبان و بیان کو تازگی بخشتا ہے۔ وہی تازگی غالبؔ کو غالبؔ بناتی ہے۔

غالبؔ کون ہے؟

غالبؔ توسن کو صبا باندھنے والا ایک خوش باش شاعر ہے، جِس کی شاعری میں وضع داری ہے، قرابت ہے، دوست کامی ہے، اور حقیقت پسندی ہے۔ اس کی شاعری میں، لِسانی تجرِبات بھی ہیں، اِختراعات بھی۔ اس کی شاعری میں عمدہ خیالات ہیں جو یکا یک دِل میں آتے ہیں۔ ان خیالات میں، وسعت ہے، کشادگی ہے، نئے نئے اِشارے اور کنایے ہیں۔ ان خیالات میں رعنائی ہے، اِستدلال ہے، شعور ہے، وِجدان ہے، ان میں تحریک بھی ہے، تجویز بھی ہے، تحسین بھی ہے، توثیق بھی ہے، اور تائید بھی۔ یہ عناصر جاری رہتے ہیں۔ اس لئے ان خیالات میں، تاویل بھی ہے، اور تشکیل بھی۔ بہ حیثیتِ مجموعی، فکرِ غالبؔ کو لفظ پر ترجیح حاصل ہے۔ لہٰذا اس کے شعری اسلوب میں، تاسیس کی ایک نئی تنویر بھی۔

غالبؔ ایک کشتہِ دشمن ہے، بیمارِ دوست ہے، حریصِ لذّتِ آزار، قطرہِ شبنم، خارِ بیاباں، ناصیہ فرسا، دلِ شوریدہ، آشفتہ سر، خستہ حال صحرا نورد ہے، جو اپنی ذات میں، نہ گلِ نغمہ ہے، نہ پردہ ساز، لیکن وہ یک گونہ بے خودی سے، شوقِ فضول

اور جرأتِ رندانہ کا حظ اٹھاتا ہے، وہ پتھّر بَن جانا چاہتا ہے، وہ پتھّر میں بھی نمک کا مزہ ڈھونڈتا ہے، وہ وقتِ شام فِراقِ جُوئے خوں سے، اپنی آنکھوں کو دو فروزاں شمعیں کہتا ہے، وہ فِراقِ یار میں، تسکین کو ناممکن سمجھتا ہے، وہ ایک غبارِ ناتواں ہے، جِسے اِحسانِ دید کی طاقت حاصل نہیں۔ داڑھی اگر وہ بڑھاتا ہے، تو سَر کے بال منڈوا دیتا ہے، تا کہ اپنے ہم عصر لمبے بالوں اور داڑھی والوں میں شمار نہ کیا جائے۔

غالبؔ ایک عاشق ہے، جو ایک ڈومنی کی اداؤں کا اسیر ہے۔ وہ اس ڈومنی کی موت کے غم کا اِظہار، موت کے چالیس برسوں کے بعد کرتا ہے، پورے اِہتمام کے ساتھ، پورے اِلتزام کے ساتھ۔ چالیس برسوں تک، جدائی کی وہ آگ خاموشی سے اپنے سِینہ میں دبائے رہنے والا غالب ایک خستہ حال گناہ گار تو ہے، کافر نہیں۔ وہ آدھا مسلمان ہے کہ شراب تو پیتا ہے، سور نہیں کھاتا، وہ صِرف وحدانیتِ رب اور رسالتِ محمدؐ کے عقائد پر اِیمان رکھتا ہے، لیکن دیگر اِسلامی تعلیمات اور احکامات سے لاتعلّق ہے۔

غالبؔ ایک غیر معمولی اِنسان ہے، فردِ فرید ہے، تمثالِ یکتائی ہے۔

لکھتا ہوں اسدؔ! سوزشِ دِل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مِرے حرف پہ انگشت

......

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دِکھاتا ہوں مَیں اِک داغِ نہاں اور

......

آتا ہے داغِ حسرتِ دِل کا شمار یاد
مجھ سے مِرے گنہ کا حساب، اے خدا! نہ مانگ

......

سخن میں خامہِ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دَم کیا ہے

......

گنجینہِ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ، غالبؔ! مِرے اشعار میں آوے

......

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر مِلے

......

غالبؔ کی اردو شاعری، بیرونی اِجتناب کا عکس ہے، اور فارسی شاعری، اندرونی جذبات کی تصویر۔ اس کی اردو شاعری میں، جبر کی قدغن ہے، اور فارسی شاعری میں، اِختیار کی وارفتگی۔ ادب شناس اس کے اردو کلام کو بھی عمدہ اور نادر مانتے ہیں، اور فارسی کلام کو بھی، گو وہ خود اپنے اردو کلام کو بے قاعدہ اور بے ضابطہ کہتا ہے۔ یوں کہیے کہ وہ اپنی اردو شاعری کو، اپنا کہتے وقت شرماتا ہے، اور اپنی فارسی شاعری میں، نقّاشی کے رنگ دیکھ کر، اِتراتا ہے۔ شاید یہ ممکن ہو کہ اپنی اردو شاعری کے معیار سے، شاعر کی یہ یک بسی کسی خارجی عنصر کی وجہ سے ہو۔ شاعر کی یہ یک بسی کی وجہ کچھ بھی ہو، بجا ہو، یا بے وجہ ہو، اہلِ نقد و نظر نے غالبؔ کی اردو شاعری کو کسی طرح تشنہِ پذیرائی نہیں رکھّا۔ نمونہِ کے طور پر، غالبؔ کے یہ دو ترجیحی اشعار ملاحظہ کیجیے:

فارسی بیں تا بہ بینی، نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہِ اردو کہ بے رنگِ من ست

......

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کر اسے سُنا، کہ یوں

بہ ہر حال، تمثالِ یکتائیِ غالبؔ کو قبولیتِ عوام بھی حاصل ہے، اور قبولیتِ خاص بھی۔ بہ لاشبہہ، برِّ کوچک خوش قسمت ہے کہ اس کے ادب کی تحسین اور تزئین میں کئی مغل زادے پورے کرّ وفر، اور شان وشوکت کے ساتھ شامل ہیں۔ ان میں ''ترک اللہ'' خواجہ ابوالحسن، الموسوم بہ حضرت امیر خسرو کی حیثیت قائدانہ ہے۔ خسرو، ''طوطیِ ہند'' ہے، کہ اس نے اپنے عارفانہ اور عاشقانہ کلام سے ہندی بھاشا کو فارسی اور عربی کی لذّتوں سے ہم کنار کیا۔ خسرو زباں دان بھی ہے، اور موسیقار بھی۔ فنون کی ہمہ جہتی اور ہمہ صفتی کے سبب، وہ اوّلون میں سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ خسرو کے کلام میں اِصفہانی رنگ ہے۔ جِس میں شیرینی ہے، عشق انگیزی ہے، زلف و خال آمیزی ہے۔ محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کے مقرّبِ خاص، مرید کا یہ رنگ، ایک اور مغل زادہ، مرزا عبدالقادر بیدلؔ کے کلام میں بھی جھلکتا ہے۔ غالبؔ، بیدلؔ کے فنِّ سخن کا دم بھرتا ہے۔

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لِکھنا
اسد اللہ خاں! قیامت ہے

بیدلؔ کی طرح، غالبؔ کی شاعری میں بھی ہندوستانی مزاج ہے۔ اس مزاج میں، زباں و بیاں کی دِل لگی ہے، بہلاوا ہے، کھیل ہے، پھیر ہے، موڑ ہے، رویّہ ہے، ڈھنگ ہے، جسمانی اور ذہنی نشست و برخاست ہیں۔ بجا، لیکن غالبؔ کے نزدیک مطلب / مقصد کی ہیئت ہندوستانی مزاج میں مقیّد نہیں۔ یہ ہیئت علاقائی نہیں، آفاقی ہے۔ یوں غالبؔ کی شاعری بہ یک وقت عام بھی ہے، اور خاص بھی ہے، عمدہ بھی ہے، اور عظیم بھی۔ ہندوستان سے منسوب شعری منظرنامہ میں، یہ طرّہِ اِمتیاز غالبؔ کے نام

ہے (بے شک، نظیؔر اکبر آبادی کی بات دیگر ہے)۔ غالبؔ کے مزاجِ شعر میں گھے عیاں اور گھے نہاں عمدگی اور عظمت کا مجوّزہ اِمتزاجِ قدر شناسی، خونِ اِنسانی کا گھوارہ بھی ہے، پاس دار بھی ہے، اور نقد و نظر کے جائزۂ میں، عیّار بھی۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے

قدرِ خونِ اِنسانی، اِنسان کی بَنائی حدوں، دیواروں، اور دیگر قدغنوں کو درخورِ اِعتنا نہیں سمجھتی، کہ آفاقی طَور پر، زندگی کے ہر موڑ پر، ہر آہ پر، ہر کسک پر، ہر خلش پر، اور ہر چوٹ پر مشترک ہے۔

فَریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

نالۂ غالبؔ، ایک علامت ہے۔ یہ علامت، ماہ و سال کی ایک گونج ہے، جس میں حیاتِ اِنسانی کے واقعات، تجرِبات، اور مشاہدات کے نشیب و فراز کی مشترک داستانیں ہیں، کہ ہر نالہ، آفاق کا ایک ''جُزوِ پریشاں'' ہے۔

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا، غالبؔ!
کہ یہ شیرازہ ہے، عالم کے اَجزائے پریشاں کا

......

وہ فِراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کِسے
ذوقِ نظّارۂ جمال کہاں

تھی وہ اِک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
مُضمحل ہو گئے قویٰ، غالبؔ!
اب عناصر میں اِعتدال کہاں

نالۂ غالبؔ وجودِ حیات کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے، اِنفرادیت کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے، اور اجتماعیت کا ثبوت بھی۔ یہ نالہ اِفہام اور شعورِ اِنساں سے ایک بالواسطہ ربط رکھتا ہے۔ نظامِ فلکی، حیوانات، نبادات اور جمادات وغیرہ کی سرشتوں کے برعکس، اِنسان، صرف اِنسان اپنے وجود سے زرا، زرا سا آگاہ ہے۔ بعض صورتوں میں، مجوّزہ وجود، اِنفرادایت سے اِجتماعیت کا ایک جُزو بنتا ہے، اور گاہے یکتائی کا مرتبہ پاتا ہے۔ سو، یہ کہیے کہ اِنسان کے علاوہ، دیگر مخلوقات اِفہام اور شعور کی صنعتوں سے محروم ہیں، شاید، کہ ان صنعتوں کا بہ یک تعلّق مادّی قوتوں سے بھی ہے اور روحانی اِرتقاء سے بھی۔ اِس اِرتقاء کا پہلا درجہ جسمانی قوت ہے، اور دوسرا درجہ ذہنی قوت ہے۔ دیگر معاشروں کی طرح، غالبؔ کے معاشرہِ میں بھی یہ دونوں قوتیں، خواہشوں اور تمنّاؤں کے ساتھ، اَفکار کے جلو میں موجود تھیں، لیکن ان کا واسطہ ہر فرد سے نہ تھا۔ مثلاً، غالبؔ کے دَور میں، شکار، شعر گوئی، اور جنگی سَر گرمیاں موجود تھیں۔ شکاری، شعراء اور فوجی ان سَر گرمیوں میں حصّہ تو لیتے تھے، لیکن مقصد کی یگانگت کے باوجود، ہم مرتبہ نہ تھے۔ اس کی بنیادی وجہ ظاہر ہے: نفسیاتی طور پر، ان میں سے بعض کے اقوال وافعال جلی تھے، بعض کے اقوال وافعال خفی تھے، اور بعض کے اقوال وافعال نہ جلی تھی، اور نہ خفی، کہ متعلّقہ افراد کی شخصیتوں پر، اقوال وافعال کے اثرات غیر معنوی تھے، یا وہ ان سے شناسا نہ تھے۔ ایک اور بات ان میں سے بعض قیادت خواہ تھے، اور بعض تقلید پسند، اور بعض کو تلوّن کی وجہ سے، بہ یک وقت، حتمی طور پر، نہ قیادت سے کوئی سروکار تھا، اور

نہ تقلید سے، بعض محض زندگی گزارنے کے ذرائع ڈھونڈتے تھے، اور بعض زندگی کو "رشکِ جناں" بنانے کے خواہاں تھے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو زندگی کے رموز کا تجزیہ کر کے، اسے بامعنی و بامقصد شکل دینے کی جستجو میں، کسی نہ کسی طرح مصروف تھے۔ اس جستجو میں، غالبؔ بھی ایک فن کار کی حیثیت سے شامل تھے۔

کسی بھی جستجو کے مآل اور معیار کا تعیّن، مقابلہ اور موازنہ کی غیر موجودگی میں نہیں کیا جاسکتا۔ مقابلہ اور موازنہ میں ہم آہنگی اور ہم سَری کا تصوّر ممکن نہیں۔ یہ عدمِ تصوّر افراد کی تعداد کم کرتا ہے، جس سے مقابلین اور موازنین کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ غالبؔ نے جستجو کے اسی نفسیاتی اصول کو سمجھا، اپنایا، اور بَرتا۔ وہ اپنے ہم عصروں سے مالی اور سیاسی اَطوار پر شاید نہ جیت سکتا ہو، لیکن فنِ سخن گوئی میں، ودیعت اور اکتساب کے باعث، اس کا پلّہ ہر حریف سے بھاری رہا، کہ فنِ سخن گوئی میں مقابلہ / موازنہ اجتماعی نہیں، انفرادی ہوتا ہے۔ غالبؔ کی ذات یکتائی کے جواہر سے مالا مال تھی۔ لہٰذا، غالبؔ ادبی میدان مارنے کا ہنر رکھتا ہے۔ اس ہنر سے، وہ اپنی فکر کو کبھی پھیلاتا تھا، اور کبھی سمیٹتا تھا۔ یوں اپنی فکر کو وہ کبھی قطرہ بناتا تھا، اور کبھی دریا، تو کبھی سمندر۔ وہ کبھی ناثر ہے، تو کبھی شاعر۔ جواہرِ یکتائیِ ذات کے باعث، اسے اپنے فنون میں اعزاز بھی حاصل تھا، اور اعجاز بھی۔ اس کا عہد فنونِ ادب کا ایک لشکر تھا۔ غالبؔ کو اس لشکر کا علم بردار کہا جاسکتا ہے، کہ وہ اعتماد و اعتبار کا حامل ہے۔

غالبؔ کی بیش تر تخلیقات میں، طرح داری ہے،؛ پہلو داری ہے، تہہ داری ہے، کہ اس کی منزل پایابی نہیں، گہرائی ہے۔ اسے اپنی دانش کی بلندی سے کوئی غرض ہے، اور نہ ہی قارئین کی پستیِ فہم سے کوئی غرض۔

نہ ستائش کی تمنّا، نہ صلہِ کی پروا
گر نہیں ہیں مِرے اشعار میں معنی ،نہ سہی

ہاں، یہ بھی ہے کہ وہ کبھی اپنے اِفتخارِ فن کا اِعلان بھی کرتا ہے، صیغہ جمع متکلّم میں :

بہ فیضِ بے دِلی نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشایش کو ہمارا عقدہِ مشکل پسند آیا

یہ کشایش، آلاتِ ہنر، تعاونِ افعال، اور اِظہارِ بیاں سے، اِزدھام کو معاشرہ، معاشرہِ کوتہذیب افراد کوقوم بناتی ہے۔اس کشایش سے، معاشرہ بھی سنورتا اور نکھرتا ہے، تہذیب بھی اور قوم بھی جلا سے ہم کنار ہوتی ہے۔اس کشایش سے، جسم اور دماغ تحفّظ بھی پاتے ہیں، اور اِرتقاء بھی۔فرحت، راحت اور طمانیت بھی۔(شاید) طمانیت ہی اس جہان میں حیاتِ بشری کے ہر سفر کی منزل ہے۔طمانیت کے حصول کے ضمن میں، روایت سے ہٹ کر، غالبؔ ایک نیا راستہ تجویز کرتا ہے:

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دِل ہے لذّت زندگانی کی

زندگی کی ہر کیفیت اسی راستہِ سے ہو کر گزرتی ہے کہیں ہاں، اور کہیں ناں۔

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

ازلی فِراق کے باعث، اِنسان اپنے وجود میں، گہے عیاں، اور گہے نہاں ''غم'' کو، اپنی زندگی کا عنوان بھی کہتا ہے، اور مقصد بھی۔یوں غالبؔ کی شاعری میں، وصال کی عنواناتی فِکر بھی جلا پاتی ہے، اور مقصدی فکر بھی۔لہٰذا، وہ اپنے مافی الضمیر ''شعار، شعور، تحت الشعور، لاشعور'' کا جائزہ ''عنوان، مقصد'' کی روشنی میں لیتا ہے، تا کہ اِکتساب، اِحتساب سے، اور ودیعت، ضبط سے ہم آہنگ ہو، ''شہود، شاہد، مشہود''

اپنے اپنے نقابوں سے باہر آئیں، راز اِفشاء ہوں، فرد وجودِ اِنفرادیت اور حِصارِ اِجتماعیت کے دائرؤں سے نکل کر ''یکتائی'' کی حد میں داخل ہو۔ اس حَد کا نام ہے، ''یک سَری''۔ غالبؔ یک سَر ہے، کہ وہ روایت کی لکیر کا پاس دار تو ہے، اس لکیر کا فقیر نہیں۔ یہی روش، غالبؔ کو 'فردِ فرید' بناتی ہے۔

امریکا میں نِصف صدی سے زیادہ مقیم، انگریزی زبان وادب کا اُستاد، پنجابی بولنے والا بندہ، بہ زعمِ خود اردو زبان کا شاعر/نقّاد، اپنی یہ رباعی، غالبؔ کی نذر کرتا ہے:

جَذبات کا ویرانہ بسایا تُو نے
اَفکار کا ماحول سجایا تُو نے
اَشعار کی تاریخ میں، غالبؔ! خود کو
یکتائی کا معیار بنایا تُو نے

۱۸۵۷ء اور غالبؔ کے خطوط

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کو اب تقریباً ڈیڑھ صدی کا طویل عرصہ ہو چکا ہے لیکن آج بھی ہم ہندوستانیوں میں اسے پہلی جنگ آزادی تسلیم کرنے میں تذبذب ہے۔ کچھ لوگ اسے غدر کا نام دیتے ہیں تو کچھ فوجی بغاوت کا جبکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ انگریزوں کے دانت کھٹے کر دینے والی یہ لڑائی، ہندوستانی جنگ آزادی کا پہلا بگل تھی جس کی تیاری تقریباً ایک صدی قبل سے جاری تھی۔ پلاسی کی لڑائی میں نواب سراج الدولہ کی شکست ہی دراصل ایک نئے باب، ایک نئے عہد کا آغاز تھی۔ علماء، دانشور، کسان، مزدور غرض ہر طبقے میں یہ احساس عام ہو گیا تھا کہ اب وہ غلام ہو چکے ہیں۔ انگریز اب تاجر نہیں ہے بلکہ حاکم بن چکا ہے۔ یہی بات ہندوستانیوں کی غیرت وحمیت کو بیدار کرنے کے لیے کافی تھی۔ تگ و دو جاری رہی۔ علماء اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ سماجی اور سیاسی رہنما اپنے طور پر انگریزوں کی مخالفت کرتے رہے۔ کچھ لوگ ہتھیار ڈال رہے تھے۔ انگریز حکومت میں اپنا وقار بچانے کے لیے، ان کا ساتھ دے رہے تھے ملک سے غداری کر رہے تھے تو دوسری طرف کچھ لوگ کسی بھی حال میں اپنی خودداری اور ملک کی عزت وحمیت کا سودا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کی لہر، اندرونی سطح پر موجزن تھی۔ کیا علماء، کیا سیاسی رہنما، کیا سماجی لیڈر، کسان یا مزدور، سپاہی ہو کہ فوجی، ہر دل میں ملک کو آزاد دیکھنے کی خواہش تھی۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں انگڑائی لینے والے اس جذبے کو میرٹھ میں تعینات فوجوں نے چربی لگے کارتوس کا استعمال نہ کر کے، تقویت بخشی۔ انگریزوں نے فوجیوں کا کورٹ مارشل کیا اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ یہی وہ لمحہ اور وقت تھا جب ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کے جذبے کی چنگاری نے شعلے کی شکل اختیار کر لی۔ میرٹھ سے دہلی اور دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں ایک منظّم کوشش یہ تھی ہماری انگریزوں کے خلاف پہلی جنگِ آزادی۔ جس میں فوجی، سپاہی، کسان، مزدور، عام آدمی، علمائے کرام، ادیب، شاعر غرض سماج کے ہر طبقے نے حصہ لیا۔

پہلی جنگ آزادی میں ہمیں زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ اس کے بہت سے

پروفیسر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

اسباب تھے لیکن ہماری اس کوشش کے جواب میں انگریزوں نے ظلم وستم کی جو داستان شہروں اور قصبات میں رقم کی وہ ہندوستانی تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ بے دریغ لوگوں کو مارا گیا۔ عام راستوں اور چوراہوں پر آزادی کے متوالوں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ گھر کے گھر صاف کر دیے گئے۔ شاہراہوں کے دوطرفہ درختوں پر لاشیں لٹکادی گئیں۔ یہ سب تاریخ کا حصہ ہے۔ 1857ء پر ہر زبان میں متعدد کتابیں تحریر کی جاچکی ہیں۔ ان میں سے زیادہ کا منبع ومخرج انگریزوں کی رقم شدہ تاریخ ہے جبکہ کچھ میں ایسے ذرائع ملتے ہیں جو ہندوستانی ہیں۔ ہمیں ہندوستانی ذرائع پر مبنی تاریخ کی ضرورت تھی۔

غالب اردو ہی نہیں ہندوستان کا بڑا شاعر ہے۔ غالب نے نہ صرف اردو بلکہ فارسی میں بھی اعلیٰ سطح کی شاعری کی۔ غالب کی شاعری بقول عبدالرحمٰن بجنوری مغلوں کے تین عطیات (تاج محل، اردو اور غالب) میں سے ایک ہے۔ غالب بطور شاعر بین الاقوامی سطح کے انیسویں صدی کے چند شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ غالب کا کمال جہاں ان کی شاعری ہے وہیں غالب کی نثر نے بھی اردو ادب میں انقلاب کا کام انجام دیا۔ خصوصاً غالب کی خطوط نگاری۔ غالب کے خطوط کی جہاں متعدد خوبیاں ہیں وہیں وہ اپنے عہد کے غماز بھی ہیں۔ عہد غالب کے سمجھنے میں غالب کے خطوط خاصے معاون ہوتے ہیں۔ غالب کا عہد، دراصل 1857ء سے قبل اور بعد کے حالات کو خصوصاً دہلی کے پس منظر میں سمجھنے کے لیے ایک بہترین ذریعہ ہے۔ غالب نے 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد کے حالات کا سامنا کیا۔ انگریزوں نے کس طرح دہلی پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔ کس طرح فوجیوں اور جوانوں کو چن چن کر مارا گیا۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت یا سازش میں شریک ایک ایک نفس کو انگریزوں نے چن چن کر مارا اور اس کام کے لیے بھی افسوس انھوں نے ہمارا ہی سہارا لیا۔ ہم سے ہی ہمارے بھائیوں کی جاسوسی کروائی اور ہم سے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے جانبازوں کو تختۂ دار تک پہنچایا۔ غدر یا جنگ آزادی کی اس پہلی کوشش کے ناکام ہو جانے کے بعد دہلی کے حالات کیا تھے۔ ان کو سمجھنے میں جہاں ہم اور چیزوں کی طرف رخ کرتے ہیں، وہیں اگر ہم خطوط غالب اور 'دستنبو' کا مطالعہ کریں تو خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ 'دستنبو

غالبؔ کی روزمرہ کی زندگی کا ڈائری نما بیان ہے۔ 'دستنبو' پر 1857ء خصوصی حوالے سے الگ سے کام کرنے کی گنجائش ہے۔ یہاں صرف غالب کے خطوط کے حوالے سے 1857ء کو دیکھنے کی کوشش کروں گا۔

خطوط غالب کی اردو ادب میں اہمیت سے کسے انکار ہوگا۔ غالبؔ کے خطوط نے اردو نثر کو عوام تک پہنچانے میں انقلاب آفریں اقدام کیا ہے۔ غالبؔ نے اپنے دوستوں، بزرگوں، مدیروں اور ناشروں کو خطوط لکھے۔ میرٹھ سے غالب کا تعلق خاص رہا ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے غالبؔ کی خاصی دوستی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا نوشہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکان مصطفیٰ کاسل (ویسٹ اینڈ روڈ، میرٹھ) اور جہانگیر آباد (بلند شہر) میں متعدد بار مہمان ہوئے۔ جب بھی میرٹھ آتے یا میرٹھ سے گذرتے شیفتہ کے مکان پر ضرور قیام کرتے۔ خطوط غالب میں شیفتہ کے نام بھی غالب کے کئی خط ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شیفتہ کے نام غالب کا کوئی ایسا خط نہیں ملتا ہے جس میں غالب نے 1857ء کا ذکر کیا ہو۔ یہ بات حیرت انگیز ضرور ہے۔ شیفتہ غالب کے اچھے دوست تھے۔ پھر 1857ء اور میرٹھ کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ایسے میں غالب نے شیفتہ کے نام کوئی خط 1857ء سے متعلق کیوں نہیں لکھا؟ یہ بات تحقیق طلب ہے۔

غالب کے دوستوں میں سکندر آباد (بلند شہر) کے منشی ہرگوپال تفتہؔ کا نام خاصا نمایاں ہے۔ خطوط غالب میں تفتہ کے نام خاصی تعداد میں خطوط ہیں۔ غالب جب بھی رامپور یا جہانگیر آباد جاتے راستے میں سکندر آباد تفتہ کے یہاں ضرور قیام کرتے۔ تفتہ سے غالب کی بے تکلفی بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ تفتہ خود بھی شاعر تھے اور غالب سے بھی مشورہ لے لیا کرتے تھے۔ 1857ء سے متعلق غالب نے جہاں اپنے دوستوں کو خط لکھے اور ان میں اپنی پریشانیوں، تکالیف وغیرہ کا ذکر کیا وہیں دہلی کے اجڑنے کا بیان اور انگریزوں کے ظلم وستم کی داستان بھی بیان کی۔ تفتہ کے نام غالب کے کئی خطوط میں 1857ء کی ہولناکیوں کا ذکر ملتا ہے۔ اس طرح کا پہلا خط 5/دسمبر 1857ء کا ملتا ہے، وہ ایک طویل خط میں ہرگوپال تفتہؔ کو اپنا، اپنے دوستوں اور دہلی کا حال لکھتے ہیں:

''صاحب!
تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگر چہ صورت اس جنم کے بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و تخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں، اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلّہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان، اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنوز البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو کہ تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجا نے صاحبان عالی شان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی، یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد

فتح، راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو، اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے، مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک، یعنی شنبہ پنجم دسمبر 1857ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کی توجہ بھی نہیں۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیئے مسلمانوں کی آبادی کا حکم

ہوتا ہے یا نہیں۔ بہ ہر حال منشی صاحب کو میرا سلام
کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمھارا خط پہنچا اور
اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو
دیا۔''

شنبہ دسمبر 1857ء اسداللہ

[خطوط غالب، مرتبہ خلیق انجم، جلد اول ،ص: ۲۶۸۔۲۶۷]

تفتہ کے نام غالب کا یہ خط 1857ء کے مئی ماہ میں ہونے والے ہنگامے کے بعد پہلا خط ہے۔ مئی 1857ء کے کئی ماہ بعد تک غالب کا کوئی خط اپنے کسی دوست کے نام نہیں ملتا ہے۔ اس سے کئی باتوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ دہلی میں مئی 1857ء کے بعد کئی ماہ تک حالات اتنے خراب تھے کہ ڈاک کا نظام بھی تہس نہس ہو گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ پوری دہلی میں اس قدر قتل عام تھا کہ ایسے میں کوئی، کسی کو خط لکھنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تیسرے غالب خود ان حالات سے نبرد آزما تھے۔ روز جاسوسی اور مخبری ہو رہی تھی۔ انگریز ہندوستانیوں کو گرفتار کر رہے تھے۔ الزامات کا دور تھا۔ ایسے میں خطوط پر بھی نظر رکھی جارہی تھی۔ انہیں وجوہات سے غالب نے کئی ماہ تک کوئی خط نہیں لکھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ غالب نے غدر کے حالات قلم بند کرنے کے لیے 'دستنبو' لکھی تھی جو کہ ان کا روزنامچہ تھا۔ 'دستنبو' میں غالب ان واقعات و معاملات کو لکھ چکے تھے۔ اس لیے خطوط میں ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔

۵/دسمبر 1857ء کو لکھے مذکورہ خط میں غالب نے دہلی خصوصاً بلی ماران کے حالات اور اپنی ناگفتہ بہ حالت کا ذکر کیا ہے۔ غالب کس طرح ایسے ہنگامی حالات میں محفوظ رہے، یہ بات بھی خط سے واضح ہو جاتی ہے۔

غالب تفتہ کو جنوری 1858ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں :

''آج سنیچر بار کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا
اور تمھارا خط لایا۔ میں نے پڑھا اور جواب لکھا اور
کلیان کو دیا، وہ ڈاک لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ
جائے۔

میں تم کو پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ دلی کا قصد کیوں کرو اور
یہاں آ کر کیا کرو گے؟ بنک گھر میں سے خدا کرے،
تمہارا روپیہ مل جائے۔
بھائی! میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج
نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی
نہیں دی۔ حکام وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔
فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں۔ بلایا نہیں گیا،
داروگیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا
جاؤں۔ مگر ہاں، جیسا کہ بُلایا نہیں گیا، خود بھی بروے کار
نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا، خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی
سے درخواستِ ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنس (پنشن)
نہیں پایا۔ کہو، یہ نو دس مہینے کیوں کر گذرے ہوں گے۔
انجام کچھ نظر آتا نہیں کہ کیا ہوگا؟ زندہ ہوں مگر زندگی وبال
ہے۔ ہر گوبند سنگھ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک بار
میرے پاس بھی آئے تھے۔ والدّعاء

روز شنبہ سوم جنوری 1858ء غالبؔ وقت نیم روز

[خطوط غالب، مرتبہ خلیق انجم، جلد اول ص: ۲۶۹-۲۶۸]

غالبؔ کے اس خط سے کئی باتیں ظاہر ہو رہی ہیں۔ ایک تو وہ دہلی کے حالات کے پیش نظر اپنے دوست کو دہلی نہ آنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ دوسرے بنک میں رکھے اپنے دوست کے پیسے کو بھی واپس مل جانے کی دعا کرتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ حالات اس طرح کے تھے کہ بینکوں میں رکھا پیسہ بھی محفوظ نہیں تھا۔ ایک اور خاص بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حالات اتنے خراب تھے کہ مخبروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ ہر شخص پر نظر رکھی جاتی تھی۔ حاکم سے ملنا، کسی کو خط لکھنا، کسی سے ملنے کا وقت لینا وغیرہ ایسے کام تھے جو مشکوک تھے۔

۳ر فروری 1858ء کو بھی غالبؔ نے تفتہؔ کو ایک خط لکھا جس میں ضروری باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ بھائی بُری آ بنی ہے انجام اچھا نظر نہیں آتا، قصہ مختصر کہ

قصہ تمام ہوا۔

جون یا جولائی 1858ء میں غالب نے تفتہ کو جو خط لکھا اس میں جہاں انہوں نے اپنی حالت کا ذکر کیا ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گئے، وہیں انہوں نے انگریزوں کے ظلم وستم کو بڑے جذباتی انداز میں قلم بند کیا ہے۔خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

"پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں ۔

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں، جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں : انگریز کی قوم میں سے، جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس میں کوئی میرا اُمید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق؛ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اس کو زیست کیوں کر نہ ہو دشوار۔ ہائے! اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا، تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔

اِنّا لِلّٰہ و اِنّا اِلیہ راجِعوُن "

جون یا جولائی 1858ء

[خطوط غالبؔ، مرتبہ خلیق انجم، جلد اول ص ۱۸۱]

غالبؔ اس خط کے ذریعہ غم جہاں کو اپنا بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 1860ء کے ایک خط میں مرزا غالب نے بڑی تفصیل سے ان حالات کا ذکر کیا ہے۔خط طویل ہے معمول کے مطابق دوسری باتیں بھی ہیں۔ دہلی پر پانچ بار آفت

وغم اور حملوں کا ذکر ہے۔اسی میں آگے لکھتے ہیں :

"جناب حافظ محمد بخش صاحب! میری بندگی۔ مغل علی خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستسقی ہو کر مر گئے۔ ہے ہے کیوں کر لکھوں، حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی ماردی اور احمد حسین خاں اور ان کے چھوٹے بھائی بھی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب جا نہ سکے، یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال، صاحبزادہ نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر بھاگے تھے، وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودے میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدرآباد میں رہے، سالِ گذشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہوگی، لیکن صرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ، جو عقبِ "کوتوالی چبوترہ" ہے اور خواجہ قاسم کی حویلی، یہ املاک خاص حضرات کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پا کر ضبط ہوئی اور نیلام ہو کر روپیہ سرکار میں داخل ہو گیا۔"

[خطوط غالب، مرتبہ خلیق انجم، جلد چہارم ص ۹۹۰-۹۸۹]

غالبؔ کا یہ خط جہاں بعض امراء کے اسمائے گرامی کے ساتھ ان کے دردناک انجام کی خبر دیتا ہے وہیں لوگوں کے شہر سے ہجرت اور لوگوں کی املاک پر سرکاری قبضے کی دلدوز داستان بھی بیان کرتا ہے۔

غالب کے مذکورہ خطوط کے مطالعے سے یہ تو ظاہر ہے کہ 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کا مرکز جب دہلی بنا اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو انگریزوں نے ظلم وستم کی کیسی دلخراش داستان دہلی کے چپے چپے پر رقم کی۔ یہی نہیں مئی 1857ء کے بعد کے چار پانچ ماہ دہلی کے جو حالات رہے کہ ہر شخص اتنا خوف زدہ تھا کہ وہ اپنے سائے سے

بھی ڈرتا تھا۔ دوست، یار، عزیز، کسی پر بھی مخبر ہونے کا شک قائم ہوتا تھا۔ غالب کے ان خطوط سے ہندو مسلم اتحاد کا بھی علم ہوتا ہے۔ ایسے میں غالب کے پاس ان ہندو دوستوں کا آنا اور غالب کا اپنے ہندو دوستوں کو خط لکھنا، ہندو مسلم دوستی کی بڑی مثال ہے۔

☆☆☆☆

حالؔی بحیثیتِ محققِ غالبؔ

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالؔی کا نام اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ ان کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی، ان کے افکار و خیالات آج بھی معنویت رکھتے ہیں۔ حالؔی بہ یک وقت شاعر، ادیب، نقاد، سوانح نگار، سیرت نگار ہونے کے ساتھ ساتھ عالم اور ملک و ملت کے ایک عظیم دانشور، مصلح اور سیاسی و سماجی مدبر بھی تھے۔

''یادگار غالبؔ'' غالبؔ کے سوانحی کوائف پر پہلی تفصیلی کتاب ہے، یہ پہلی مرتبہ محمد رحمت اللہ رعد کے نامی پریس، کانپور سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے غالبؔ کی وفات کے فوراً بعد رسالہ ''ذخیرۂ بالگوبند'' آگرہ کے مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں غالبؔ کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا، جو مسعود حسن رضوی ادیب کے مطابق غالبؔ کے حالات پر غالباً سب سے پہلا مضمون ہے۔ اس کے بعد محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں غالبؔ کے سوانحی کوائف پر روشنی ڈالی تھی۔ لیکن غالبؔ پر پہلی با قاعدہ سوانحی عمری لکھنے کا سہرا حالؔی کے سر جاتا ہے۔ حالؔی کے بعد سوانح عمریوں میں شیخ محمد اکرام کی ''غالبؔ نامہ'' (۱۹۳۶ء) مولانا غلام رسول مہر کی ''غالبؔ'' (۱۹۳۶ء) اور مالک رام کی ''ذکر غالبؔ'' (۱۹۳۸ء) قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام سوانح عمریوں میں کسی نہ کسی طور پر حالؔی کا رنگ نظر آتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حالؔی نے ''یادگار غالبؔ'' کی شکل میں جو پودا لگایا تھا مذکورہ محققین نے اس کی آبیاری کر کے تناور درخت بنا دیا۔

''یادگار غالبؔ'' دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں غالبؔ کی زندگی کے حالات کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں ان کے کلام نظم و نثر فارسی کا انتخاب اور اس پر ریویو ہے۔

''یادگار غالبؔ'' کا پہلا حصہ جو غالبؔ کے سوانحی حالات پر مشتمل ہے، بقول

پروفیسر شبنم حمید، صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

رشید حسن خاں ''تحقیق کے ذیل میں آتا ہے۔'' اس میں حالؔی نے غالبؔ کے خاندانی پس منظر اور پیدائش سے لے کر شادی، سفر، ملازمت، وظیفہ، قید و بند، تصنیف وتالیف، علمی استعداد، اخلاق و عادات، لطائف وغیرہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ حالؔی کی اس کتاب کے ماخذ مرزا غالبؔ اور ان کی تصنیفات، دوستوں اور بزرگوں کے ذریعہ فراہم کی گئی معلومات وغیرہ ہیں، جو ان کو مرزا کی صحبت سے نصیب ہوئی تھیں۔

''یادگار غالبؔ'' کی روشنی میں حالؔی کی تحقیق نگاری کا جائزہ لینے سے پہلے یہ جان لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تالیف سے حالؔی کا مقصد کیا تھا؟ ''یادگار غالبؔ'' کے دیباچے میں حالؔی لکھتے ہیں:

> ''مرزا کی لائف میں کوئی منوہ بالشان واقعہ ان کی شاعری وانشاپردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ لہٰذا جس قدر واقعات ان کی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں، ان کو ضمنی اور استطراری سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب وغریب ملکے کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا، اور جو کبھی نظم ونثر کے پیرائے میں، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رند مشربی کے لباس میں، اور کبھی تصوف اور حب اہل بیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا، اس کتاب کے موضوع

سے خارج سمجھنا چاہیے۔'' [1]

منقولہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حالؔی کا مقصد غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کو جسے انھوں نے ''عجیب وغریب ملکہ'' کا نام دیا ہے، لوگوں پر ظاہر کرنا تھا۔ یہاں اس سوال سے بحث ممکن نہیں ہے کہ حالؔی کو غالبؔ کی اس حیثیت کو منوانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ میرے خیال سے اس سلسلے میں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ بشمول غالبؔ اوران کے معتقدین جن میں بے شک حالؔی کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے، کو یہ شکوہ تھا کہ غالبؔ کوان کی زندگی میں وہ قدر ومنزلت نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ بہرکیف اب حالؔی کی اس بات پر آتے ہیں جس میں انھوں نے کہا ہے کہ ''پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا، اس کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر حالؔی کی ذمہ داریاں ختم نہیں ہو جاتیں۔ اس لیے کہ ''یادگار غالبؔ'' غالب شناسی کے باب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

حالؔی باقاعدہ طور پر محقق نہیں تھے، ان کا ذہن تحقیقی سے زیادہ تنقیدی تھا، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان میں تحقیقی صلاحیتیں بالکل نہ تھیں۔ 'حیات سعدی' اور 'حیات جاوید' اس کی بین مثال ہیں۔ اکثر محققین وناقدین غالبؔ کو اس بات کا شکوہ ہے کہ حالؔی نے 'حیات سعدی' اور 'حیات جاوید' کی تصنیف وتالیف پر جس قدر وقت اور محنت صرف کی ہے اگر ''یادگار غالبؔ'' پر بھی کر لیتے تو آج اس کی اہمیت کچھ اور ہوتی۔ اس بات میں بہت حد تک سچائی ہے لیکن حالؔی کے نزدیک مرزا کے حالات اور سوانحی کوائف ثانوی حیثیت رکھتے تھے یا انھوں نے انھیں اس وجہ سے ثانوی بنا دیا کہ اوّلیت دینے میں وہ عوام پر غالبؔ کی عظمت کا وہ تاثر نہ قائم کر پاتے جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے انھیں حالات وواقعات کا انتخاب کیا جو ان کے مقصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہو سکیں۔ کچھ باتوں کا ذکر ضرور کیا ہے وہ اس لیے کہ شاید انھیں معلوم تھا

کہ یہ باتیں عوام میں مشہور ہیں لہٰذا ان سے اجتناب ناگزیر ہے دوسرا یہ کہ ان واقعات کے ذکر میں بھی حالؔی پہلو بچاتے نظر آتے ہیں مثال کے طور پر قید ہونے کا واقعہ انھوں نے اپنے طور پر نہ بیان کر کے غالبؔ کے ایک خط کا حوالہ دے دیا جس میں غالبؔ خود کو بے قصور قرار دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ محققین نے ''یادگارِ غالبؔ'' کے ضمن میں حالؔی کے جن تحقیقی مسامحوں کی نشاندہی کی ہے ان میں مرزا یوسف کی وفات کا ذکر، غالبؔ کے سفرِ کلکتہ کو تیس کے بجائے چالیس کی عمر میں بتانا۔ غالبؔ کا لکھنؤ میں ورود غازی الدین حیدر کے بجائے نصیر الدین حیدر کے دور میں بتانا۔ غالبؔ کی مثنوی ''ابر گہر بار'' کو آخری عمر کی تخلیق بتانا، جب کہ یہ غالبؔ کی وفات سے چوبیس برس پہلے شائع ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں غالبؔ کے اخلاق و عادات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں وہ ایک سوانح نگار سے زیادہ سعادت مند شاگرد اور معتقد و مداح نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ''یادگارِ غالبؔ'' کے پہلے حصے میں جس کا براہ راست تعلق تحقیق سے ہے بیشتر حالات کی تفصیل نہیں ملتی اور کئی بیانات نقطۂ نظر سے تشنہ نظر آتے ہیں۔

حالؔی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے غالبؔ کے حالات کے ضمن میں اپنی جانب سے کچھ کہنے کے بجائے خود غالبؔ کی تحریروں (خطوط یا ان کا خلاصہ) کو پیش کر دیا ہے۔ اور ایک سوانح نگار کی حیثیت سے کوئی جائزہ نہیں لیا ہے اس طریقہ کار نے بقول رشید حسن خاں کئی واقعات کی حقیقی شکل صورت کو سامنے نہیں آنے دیا۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے کیونکہ حالؔی کے پاس موقع تھا اور وسائل و ذرائع بھی موجود تھے، اگر چاہتے تو بہت سی باتیں بیان کر سکتے تھے جو انھوں نے نہیں کیں۔ میری رائے میں کچھ باتیں تو ایسی ہیں کہ اگر نہ بیان کی جاتیں تو شاید بہتر ہوتا یا بیان بھی کی جاتیں تو اس طرح کہ ان سے کچھ نتائج برآمد ہو

سکتے۔ مثلاً ملا عبدالصمد کا قضیہ، غالبؔ نے اپنی کئی تحریروں میں فارسی زبان میں ملا عبدالصمد سے کسب فیض اور شاگردگی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن قاضی عبدالودود، امتیاز علی خان عرشی اور رشید حسن خاں یہ مانتے ہیں کہ ملا عبدالصمد کا وجود فرضی ہے اور ناقدین کا منہ بند کرنے کے لیے خالصتاً غالبؔ کے اپنے ذہن کی تراشی ہوئی ایک شکل ہے۔ حالیؔ کے پاس یہ موقع تھا کہ وہ اس قضیے کو پیدا ہونے سے روک سکتے تھے۔ انھوں نے اس پہیلی کو سلجھانے کے بجائے اور الجھا دیا۔ لکھتے ہیں:

> ’’ایک شخص پارسی نژاد، جس کا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہرمزد تھا اور بعد مسلمان ہونے کے عبدالصمد رکھا گیا، غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا، جو دو برس تک مرزا کے پاس اوّل آگرے میں اور پھر دلّی میں مقیم رہا۔ مرزا نے اس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی۔‘‘ [۲]

حالیؔ یہیں ٹھہر جاتے تو بہتر ہوتا لیکن انھوں نے یہاں اپنی بات ختم نہیں کی بلکہ آگے لکھتے ہیں:

> ’’اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ ’’مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے، اور عبدالصمد محض فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے۔‘‘ [۳]

اتنا کہنے کے بعد اگر حالیؔ یہ فیصلہ کر دیتے کہ عبدالصمد کا وجود فرضی تھا یا واقعی تو بات صاف ہو جاتی۔ لیکن انھوں نے غالبؔ کی دونوں باتوں کو یکساں طور پر بیان کیا۔

اس پر مزید لکھتے ہیں:

''مگر اس میں شک نہیں کہ عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔ چنانچہ مرزا نے جا بجا اس کے تلمیذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اس کو بلفظ تیمسار، جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے، یاد کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے، مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبد الصمد کے مکان پر وارد ہوا ہے۔ اور کل دو برس اس نے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گزری تو عبد الصمد اور ان کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔''[۴۴]

منقولہ عبارت میں آخر میں حالؔی نے ملا عبد الصمد کے وجود پر شبہ کا اظہار ضرور کیا ہے لیکن استاد کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ ان کی کسی بات کو رد نہیں کیا۔ لہٰذا ملا عبد الصمد وجود کے اثبات میں آگے لکھتے ہیں:

''جیسا کہ قاطع برہان اور درفش کاویانی کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے، اس نے تمام فارسی زبان کے مقدم اصول اور گر اور پارسیوں کے مذہبی خیالات

اور اسرار، جن کو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل
ہے، اور پارسی و سنسکرت کا متحدالاصل ہونا اور اسی قسم کی
اور ضروری باتیں مرزا کے دل میں بہ وجہ اولیٰ تہہ نشیں کر
دی تھیں۔''۵

استاد اور شاگرد دونوں نے اس گتھی کو اتنا الجھا دیا ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی کوئی حتمی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

مذکورہ بالا تمام خامیوں کے باوجود حالؔی جیسے شریف النفس انسان کی دیانتداری پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک انھوں نے سوانح نگار سے زیادہ سعادت مند شاگرد اور مداح و معتقد ہونے کا فرض ادا کیا لیکن نیر مسعود کے مطابق ان پر تحقیقی بد دیانتی کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ نیر مسعود ''یادگار غالبؔ'' میں حالؔی کی تحریروں میں مضمر تحقیقی اشاروں کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ:

''یہ سب حیلوے ایک طرف اور حالؔی کی دیانتداری ایک
طرف۔ حالؔی پر یہ الزام آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ
انھوں نے غالب کا حق تو ادا کیا، مگر غالبؔ پر تحقیق کا حق
ادا نہیں کیا۔ اور غالباً اسی الزام سے بچنے کے لیے انھوں
نے ''یادگار'' کے سوانحی حصے کو ضمنی اور استطراری قرار
دیا۔ لیکن ان پر تحقیقی بد دیانتی کا الزام عائد نہیں کیا جا
سکتا۔ ہم نے گذشتہ صفحات میں کئی ایسی مثالیں دیکھیں
جہاں ان کے بیان کے ظاہری مدعا کے ساتھ ساتھ
حقیقت کسی اور روپ میں بھی جھلکتی نظر آتی ہے، اور اس
طرح ان کے بیان میں ایک قسم کا اندرونی تضاد پیدا ہو

گیا۔ واضح فکر اور واضح انداز بیان کے مالک حالؔی
کے بارے میں یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ ان کی تحریر
کے یہ تضادنا دانستہ اور بے خیالی کا نتیجہ ہیں۔ حقیقت
شاید یہ ہے کہ ان تضادات کے پردے میں حالؔی نے
تحقیق کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔'' ۶

غالبؔ شناسی کے سفر نے کئی مراحل طے کر لیے ہیں اور اس سفر میں غالبؔ سے متعلق بہت سی نئی باتیں سامنے آئی ہیں لیکن ان سب کے باوجود ''یادگار غالبؔ'' کی حیثیت آج بھی بنیادی اور اساسی ہے۔ اپنی بات کے اثبات میں، میں یہاں اردو کے صرف دو بلند پایہ محققین مالک رام اور رشید حسن خاں کے بیانات کا حوالہ دینا چاہتی ہوں۔ مالک رام ''یادگار غالبؔ'' کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس ۷۰ برس میں غالبؔ کے حالات کی چھان بین
میں پوری کوشش صرف ہوئی اور اس کی کئی بہت اچھی
سوانح عمریاں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے کلام کی
تشریح و توضیح اور تجزیے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی
گئی۔ اس کے باوجود نہ ''یادگار غالبؔ'' کی تازگی
میں کسی طرح کی کمی آئی واقع ہوئی ہے، نہ اس کی
افادیت میں فرق آیا ہے۔'' ۷

رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''مقدمۂ شعر و شاعری کی طرح ''یادگار غالبؔ'' کو
بھی اپنے موضوع پر بنیادی کتاب کی حیثیت حاصل

ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں مرزا صاحب کی شخصیت،
اردو نثر اور اردو شاعری سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے،
اس کے باوجود سو برس سے زیادہ پرانی کتاب ''یادگار
غالبؔ'' کی اساسی حیثیت آج بھی برقرار ہے۔''[۸]

مذکورہ بالا محققین نے بھی تحقیقی نقطۂ نظر سے ''یادگار غالبؔ'' کے حوالے سے حالیؔ پر اعتراض کیے ہیں پھر بھی اس کی اساسی اہمیت وافادیت کو تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی حالیؔ کی اس کوشش کو سراہنا چاہیے اور اپنے بزرگوں کی طرح چراغ سے چراغ روشن کرتے ہوئے غالبؔ شناسی کے لیے نئی راہوں کو ہموار اور روشن کرنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

حوالے:۔

۱۔ دیباچہ ''یادگار غالبؔ'' از خواجہ الطاف حسین حالیؔ تصحیح و ترتیب مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۶

۲۔ ''یادگار غالبؔ'' از خواجہ الطاف حسین حالیؔ تصحیح و ترتیب مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۶

۳۔ ایضاً، ص ۲۶

۴۔ ایضاً، ص ۲۶

۵۔ ایضاً، ص ۲۷

۶۔ محققین غالبؔ: حالیؔ از ڈاکٹر نیر مسعود مشمولہ تحقیقات مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۳۱۹

۷۔مقدمہ ''یادگارِ غالبؔ'' از مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۹۴ء

۸۔یادگارِ غالبؔ از رشید حسن خاں، ص ۲۰

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اور الہ آباد

شاعر ذی مرتبت مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ غالبؔ کی ولادت ۲۷/ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام مرزا عبد اللہ بیگ خاں اور والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔ آپ ابھی پانچ برس کے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ۱۳/ برس کی عمر میں دہلی منتقل ہو گئے۔ اس وقت ان کی زوجہ امراؤ بیگم اور بھائی یوسف خان ان کے ہمراہ تھے۔ غالبؔ نے ۱۵/ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں اس دار فانی کو الوداع کہہ دیا۔ اس طرح غالبؔ کی عمر سات دہائی سے زیادہ پر محیط ہے اور انھیں اس جہان سے کنارہ کش ہوئے تقریباً ڈیڑھ صدی گذر چکی ہے۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ غالبؔ آج بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ ان کا کلام اس عہد کو نئی ادبی بنیاد فراہم کر رہا ہے۔ کلام غالبؔ کے نت نئے ترجمے ہو رہے ہیں تو دوسری طرف نئی دریافت ہو رہی ہے۔ گویا ان کے گنجینۂ معنی کا طلسم ابھی پوری طرح کھلا نہیں ہے۔ بقول پروفیسر شمیم حنفی، کلام غالبؔ ابھی فرسودہ نہیں ہوا ہے۔ یہ وہی غالبؔ ہیں جن کے لئے رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں کہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو کیا دیا تو وہ بے تکلف تین نام لیں گے غالبؔ اردو اور تاج محل۔ غالبؔ آج بھی شدت سے پڑھے جا رہے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ ابھی کلام غالبؔ کی تفسیر باقی ہے۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی جو غالبؔ کے ہم زمان تھے انھوں نے یادگار غالب لکھ کر غالبؔ کی حقیقی عظمت پر توجہ مبذول کی۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ انگنت شارحین و محققین غالبؔ اپنی فکر و نظر کے چراغ تا حال کلام غالبؔ سے روشن کر رہے ہیں۔ مرور زمانہ کے ساتھ ان کے کلام کی قرأت کے علاوہ دیگر تجربے بھی کئے جا رہے ہیں۔ مثلاً غالبؔ کو لے کر ڈرامے لکھے جا رہے

پروفیسر صالحہ رشید، صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

ہیں، فلمیں اور ٹی وی سیریلز بن رہے ہیں۔ محفلوں میں ان کی غزلیں گائی جا رہی ہیں تو ان کی مثنوی چراغ دیر پر کتھک رقص پیش کر مشہور رقاصہ شوونا نارائن نے دنیا کو حیران کر دیا۔ ان کے اشعار پر پینٹنگس بن رہی ہیں۔ اکیڈمیاں، اسکول کالج ،تنظیمیں یہاں تک کہ سڑکوں اور کالونیوں کے نام بھی ان کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ حدتو تب ہوگئی جب کووڈ۔۱۹ کے دوران ان کے خط کی اتباع کرتے ہوئے ایک انتہائی پرلطف خط کرونا کو مخاطب کر کے لکھ دیا گیا۔ اس مضمون کا محرک بھی غالبؔ کا ایک خط ہے جس میں دوران سفر کلکتہ، انھوں نے شہر الہ آباد کے تعلق سے گل افشانی کی ہے۔ غالبؔ کو آج بھی اتنی شدت سے یاد کیا جا رہا ہے، اس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مرزا غالب کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں نظم و نثر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ وہ جس طرح اپنی تحریر میں منفرد اسلوب رکھتے ہیں اسی طرح ان کی شخصیت پر نگاہ ڈالیں تو وہ وہاں بھی جداگانہ نظر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے پیچ و خم کو جاننے کے لئے ڈاکٹر تقی عابدی کے مندرجہ ذیل خیالات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

> ”جس زمانے میں ہر شخص اردو پر سر دھنتا تھا، اس وقت وہ فارسی کی قلمیں لگا رہے تھے۔ جس دور میں شعراء اپنے کو اردو شاعر کہتے ہوئے اتراتے تھے، غالبؔ اردو سے کتراتے اور فارسی نظم و نثر کو اپنا تفاخر سمجھتے تھے۔ جہاں لوگ درباری مدح وثنا کو مایۂ افتخار سمجھتے تھے، غالبؔ اسے سایۂ ننگ جانتے تھے۔ جہاں سلیس اور آسان لفظوں میں شعر کہنا صنعت سمجھا جاتا، وہاں غالبؔ ندرت خیال اور مشکل

بیان کو ترجیح دیتے تھے۔''

غالبؔ نے یوں تو اپنی زندگی میں کئی سفر کیئے مگر ان کا کلکتہ کا سفر اور اس کی روداد بہت مشہور اور دلچسپ ہے۔ اس سفر کے پہلے مرحلے میں وہ ۲۷/اپریل ۱۸۲۷ء کو دہلی سے لکھنؤ پہنچے۔ وہاں سے ۲۷/جون ۱۸۲۷ء کو کانپور کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد باندہ کا رخ کیا۔ یہاں ان کا قیام چھ ماہ رہا۔ باندہ سے الہ آباد ہوتے ہوئے وہ بنارس چلے گئے۔ گویا دوران سفر کلکتہ غالبؔ کا گذر الہ آباد سے ہوا۔ کلیات مکتوبات فارسی غالبؔ مرتبہ پرتو روہیلہ میں ۳۷/خطوط درج ہیں جو انھوں نے مولوی محمد علی خان، صدر امین باندا، بوندیل کھنڈ کے نام لکھے ہیں۔ ان میں بارہواں خط مشتمل بر ہجو الہ آباد وصفت بنارس عنوان سے ہے۔ غالبؔ نے الہ آباد میں بمشکل ۲۴/گھنٹے گذارے مگر جو باتیں یہاں ناگوار گذریں ان کا ذکر شکایتاً اس خط میں کیا ہے۔ پہلے خط میں چلہ تارا سے فتحپور کے سفر کی تیاری کا ذکر کرتے ہیں۔

''امشب در چلہ تارا رسیدہ، بامدادان اگر حیات باقیست
،بسیج راہ فتحپور کردہ خواہد شد۔''
(آج رات چلہ تارا میں گذار کر کل اگر زندگی باقی رہی،
فتحپور کی جانب سفر ہوگا)

دوسرے خط میں وہاں سے الہ آباد کے سفر کا ارادہ یوں بیان کرتے ہیں۔

''خلاصۂ تحریر اینکہ آخر از بیداد گردون دون ستوہ آمدہ خود را بدریا انداختہ ام، یعنی ہم ازین مقام کشتی بکرایہ گرفتہ و آدم و متاع ہمہ دروے گنجیدہ و بسم اللہ مجریھا و مرسیھا بر خواندہ سفینہ در رود جمن راندہ ام۔ منظور اینکہ بہ الہ آباد رسیدہ توقفی کہ در بنارس می خواستم کرد ہم درین بقعہ کار

بندم و روزے چند آسایشے کردہ ما یحتاج بہ امضاء
رساندہ رہگرا شوم ودیگر جز مرشد آباد بنگالہ در ہیچ جا
توقف نگزینیم۔ حال سفر دریا نیز درین دو سہ روز
پنہاں نخواہد ماند۔ کشتی بانان گویند کہ درعرصۂ سہ روز
بہ الہ آباد رسیدہ خواہد شد۔''

(مختصر یہ کہ گردون دون کے ستم سے تنگ آ کر میں نے خود کو دریا میں ڈال دیا ہے یعنی اسی جگہ سے کشتی کرایے پر لے کر سارے آدمی اور سامان اس میں بھر کر بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا پڑھ کر کشتی دریائے جمنا میں ڈال دی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ الہ آباد پہنچ کر جتنا قیام میں بنارس میں کرنا چاہتا تھا (وہاں کرلوں) اور اسی جگہ کچھ کام اور چند روز آرام کر کے ضرورت کا سامان فراہم کر کے عازم سفر ہوں اور بنگال کے (شہر) مرشد آباد کے علاوہ کسی جگہ نہ ٹھہروں۔ ان دو تین دنوں میں دریا کے سفر کا احوال بھی معلوم ہو جائے گا۔ کشتی بان کہتے ہیں کہ تین دن میں الہ آباد پہنچ جائیں گے)

غالبؔ الہ آباد پہنچے اور یک شب و روز قیام کرنے کے بعد وہاں سے بنارس کا رخ کیا۔ بنارس پہنچ کر مولانا محمد علی، صدر امین باندا کو الہ آباد کی روداد شکایتاً یوں تحریر کرتے ہیں۔

این شکایت نامۂ آوارگی ہائے من است
قصۂ درد جدائی ہا ، جدا خواہم نوشت

(یہ میری آوارگی کا شکایت نامہ ہے، جدائی کے درد کی داستان الگ سے لکھوں گا)

مغلوب سطوت شرکا، غالب حزین
کاندر تنش ،ز ضعف ، توان گفت ، جان نہ بود

گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است
ما را بہ این گیاہ ضعیف این گمان نہ بود
(غالب حزین شر کائے (سفر حیات) کی شان وشوکت سے اس طرح مغلوب ہو گیا ہے گویا ضعف سے اس کے جسم میں جان ہی نہیں تھی۔ کہتے ہیں وہ بنارس تک زندہ پہنچ گیا ہے۔ ہمیں گھاس کے اس نحیف تنکے سے یہ توقع نہ تھی)

چلہ تارا میں ان پر کیا گذری اس کی روداد یوں سناتے ہیں۔

''آنچہ تا منزل چلہ تارا گذشت ، در دو عرضداشت ، کہ یکے ۔۔۔ گردون بان ، و یکی بہ سفارت شخصی نا آشنائے مجہول الاحوال ، مرسل گردیدہ است ، بہ تحریر رسیدہ۔ خوش آن کہ یکی از آن ۔۔۔ بارسائی طالع ، بہ بزم قبول نگاہ رسیدہ باشد۔ بہر رنگ ، از آن معبر کشتی بہ کرایہ گرفتم ، و با آدم و چاروا در آن نشستہ ۔۔۔ از پیچ و تاب ریح معدہ و امعا در کشاکش ، و دل از ۔۔۔ حرارت غریبۂ حمی ، بر آتش روز ہفتم ، بہ ویرانہ ۔۔۔ ورود افتاد۔

(چلہ تارا تک کیا بیتی ، یہ احوال میں دو خطوط میں ، جن میں سے ایک گاڑی بان کے اور دوسرا ایک غیر معروف نا آشنا شخص کے ذریعے بھیج چکا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوا گر میری خوش قسمتی سے ان میں سے ایک ۔۔۔ نگاہ قبول کی بزم میں پہنچ چکا ہو۔ بہر حال اس گھاٹ سے میں نے کشتی کرایے پر لی اور آدمی اور چوپایوں کے ساتھ اس میں بیٹھ کر اس صورت میں کہ معدے اور آنتوں میں ریاح

بھر جانے کی وجہ سے سخت بیچین تھا اور دل بخار کی تپش سے سلگ رہا تھا۔ساتویں روز ویرانے (الہ آباد کے) میں پہنچا)''

الہ آباد اترنے کے بعد کا ماجرا اس طرح بیان کیا ہے۔

''آہ از الہ آباد، ولعنت خدا بر آن خرابہ باد، کہ نہ در وے دوائے درخور بیمار، ونہ متاعے شائستۂ مردم بزم ۔۔۔مردو زنش ناپیدا و مہر و آزرم، از طبع پیر و جوانش گم۔سوادش سرمایۂ روسیاہیٔ آفاق وخراب آبادش، مرز (کذا) دو منزلہ ۔۔۔چہ نا انصافی است، این وادیٔ ہولناک را شہر نامیدن، وچہ بے حیائی است، آدم زاد را درین دامگاہ غول آرمیدن۔ صحن جہنم بدین ۔۔۔بومش، مقابل می نہند، پر از آتش است و ہوائے زمہریر، ازین اندوہ، کہ بہ صرصر آن، برودت کدہ اش، نسبت می دہند، خیلی ناخوش۔چون شنیدہ است کہ بدان را بہ نیکان، می بخشند خود را، بہ ہزار امیدواری، بلکہ بہ صد ہزار خواری در پہلوئے بنارس انداختہ است و گنگ را، بطریق شفاعت، سویش روان ساختہ۔

(افسوس الہ آباد! اس ویرانے پر خدا کی لعنت برسے کہ وہاں نہ تو بیمار کے لئے دوا ملتی ہے اور نہ کسی مہذب انسان کی ضرورت کی کوئی چیز ملتی

ہے۔۔۔اس کے لوگوں میں نہیں اور محبت اور حیا وہاں
کے پیر و جوان میں نایاب ہے۔اس کے نواح واطراف
دنیا کے لئے سرمایۂ روسیاہی اوراس کی ویران آبادی
۔۔۔دومنزلہ۔۔۔۔اس ہولناک وادی کوشہر کہنا سراسر
ناانصافی ہےاوراس بھوتوں کی بستی میں کسی انسان کا رہنا
کیسی بے حیائی ہے۔جہنم کا صحن ۔۔۔اس سرزمین کے
مقابلے رکھیں تو آگ ہو جائے اور اگر ہوائے زمہریر کو
اس نم زدہ علاقے کی آندھی سے نسبت دی جائے تو کافی
ناخوش ہو۔چونکہ اس شہر نے یہ سن رکھا ہے کہ نیکوں کے
ساتھ بدوں کی بھی بخشش ہو جاتی ہے،اس نے بھی اپنے
آپ کو ہزار امید واری اور بے اندازہ خواری کے ساتھ
بنارس کے پہلو میں لگا رکھا ہےاور گنگا کو شفاعت کے طور
پر اس کی طرف رواں کر دیا ہے)''

آگے کے احوال مزید دلسوز ہیں۔

''ہر چند بہ سوئے این روسیاہ بنگریستن بر طبع نازک
بنارس،گران است،اما بدین پشت گرمی ، دلش آب می
خورد کہ پائے گنگ درمیان است۔بخدا کہ اگر بازگشت
از کلکتہ،منحصر درراہ الہ آباد باشد، بہ ترک وطن گویم، و راہ
معاودت (نہ پویم)۔بالجملہ یک شبا روز، درآن دیولاخ
، بہ جرم فقدان بار برداری ، زندگانی بودہ، روز دگر چون
بہل کرایہ پیدا شد، سحر گاہان ،(بر ساحل گنگ رسیدہ)

زود، چون باد از آب گذشتم و بہ پائے شوق، سوئے
بنارس، گرم پویہ گشتم۔

(ہر چند کہ بنارس کی طبع نازک پر اس روسیاہ (شہرالہ
آباد) کی طرف دیکھنا بھی گراں ہے لیکن یہ اس
تقویت پر امیدوار ہے کہ گنگا کا واسطہ درمیان میں
ہے۔خدا کی قسم اگر کلکتے سے واپسی پر الہ آباد کے
راستے جانا پڑا (تو) وطن ترک کر دوں گا پر ہرگز اس
راستے واپس نہ جاؤں گا۔غرضے کہ پورے ایک دن
رات بار برداری کا انتظام نہ ہونے کے جرم میں اس
بھوت نگر میں گرفتار رہ کر دوسرے دن جب کرائے
کی بہلی ملی تو صبح سویرے گنگا کنارے پہنچ کر ہوا کی
طرح پانی (دریا) کو عبور کر گیا اور پائے شوق سے
جانب بنارس تیز گامی کی)''

غالبؔ الہ آباد کی گرمی اور دیگر تکالیف کو برداشت کرنے کے بعد نالہ کنان بنارس کی زمین پر قدم رکھتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ ایک آن میں وہاں کے ذرے ذرے سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔اسی خط میں ذکر بنارس اس طرح کرتے ہیں گویا قدرت نے پوری فضا از سر نو خوشگوار کر دی ہو۔ملاحظہ فرمائیں۔

''روز ورود بنارس بادے جانفزا و نسیمے ۔۔۔ آسا، از
جہت مشرق وزید، و جانم را توان، و دلم را روان
بخشید۔اعجاز آن مشت ہوا غبارم را، چون علم فتح، بر
افراشت و اہتزاز آن نسیم اثر ضعف در من نہ

گذاشت۔خوشا، سواد بنارس کہ اگر از فرط دل نشینی
سویدائے عالمش خوانم بجاست و حبذا ، اطراف آن
معمورہ، کہ اگراز جوش سبزہ وگل، بہشت روئے زمینش،
دانم رواست،ہوایش ۔۔۔خدمت جان در کالبد
اموات دمیدن و ذرہ خاکش را ، چون جوہر آہن ربا،
منصب پیکان خار، از پائے را روان کشیدن۔گنگ اگر
سر بہ پایش، نہ سودے درنظر ما، این قدر گرامی نہ بودے،
و خورشید ، اگر بر دیوار و درش نہ گذشتے (بدین گونہ
فروزان) وتابناک نہ گشتے۔بعرض۔۔۔روانی بحرطوفان
خردش گنگش ،خانۂ ساکنان ملاءواعلیٰ ،سیلابی است،وبہ
جلوہ گاہ پری چہرگان (سبزہ رنگ) کتان خانہا ی
قدسیان ماہتابی۔اگراز کثرت عمارت،قاف تا قافش سخن
رانم سراسر دیر سار مستان است۔ و اگر از سبزہ وگل
اطرافش،فصلے فروخوانم، بیابان در بیابان بہارستان۔
(بنارس پہنچنے کے دن باد جانفزا اور نسیم ۔۔۔آسا مشرق
کی جانب سے چل رہی تھی اور جان کوتوانائی اور روح کو
بالیدگی دے رہی تھی۔اس ہوا کے اعجاز نے میری مٹھی بھر
خاک کوفتح کے جھنڈے کی طرح بلند کر دیا اور اس ٹھنڈی
ہوا کی مستی نے میرے جسم کی ساری کمزوری رفع کر
دی۔کیا کہنے نواح بنارس کے کہ اگراس کوفرط دلنشینی کے
سبب نقطۂ قلب عالم کہوں تو بجا ہے اور کیا کہنے ہیں اس

بستی کے جوانب کے کہ اس کو فرط سبزہ وگل کے
باعث روئے زمین ہر جنت جانوں تو جائز ہے۔اس
کی آب و ہوا اموات کے جسم میں جان ڈالنے کی
خدمت انجام دیتی ہے اوراس سرزمین کے ذرے
ذرے کی یہ خاصیت ہے کہ جوہر مقناطیس کی طرح
راستہ چلنے والوں کے پاؤں سے چبھے ہوئے تیروں
کی نوک کے کانٹوں کو نکال لیتا ہے۔ ہماری نظر میں
اگرگنگا بنارس کے قدموں سے اپنا سر نہ رگڑتی تو اس
تقدس کی اہل نہ ہوتی اور اگر سورج کا اس کے در و
دیوار سے گذر نہ ہوتا تو وہ اس قدر فروزاں اور
تابناک نہ ہوتا۔گنگا اپنی لہروں کی روانی سے گویا بحر
طوفان ہے، جس سے ساکنان ملاء و اعلیٰ کے گھر
سیلابی ہو گئے ہیں اور پری چہرگان سبزہ رنگ کے
جلوے سے قدسیوں کے کتان خانے ماہتابی ۔اگر
میں اس شہر کی ایک سرے سے دوسرے سرے تک
کی، عمارات کی کثرت کا بیان کروں تو گویا یہ سراسر
مستوں کے عبادت خانے ہیں اور اگر اس کی نواح
کے سبزہ وگل کی ایک فصل بھی پڑھوں تو یوں لگے جیسے
بیاباں در بیاباں بہارستان ہے)''

غالبؔ نے کلکتہ میں کافی وقت گذارا مگر پنشن کی بات نہ بن سکی۔حتیٰ کہ انھوں نے واپسی کا ارادہ کیا اور ضمناً الہ آباد کا ذکر ان کی زبان پر آ گیا۔مثلاً خط نمبر

۳۲؍میں لکھتے ہیں۔

’’در ماہ ستمبر کہ بعد ازین ماہ بہ ہفدہ ہژدہ روزمی آید، دفتر خانہ بہ راہ دریا روان خواہد شد، و آخر اکتوبر جناب لارڈ صاحب یا بہ ڈاک یا بہ جہاز دخانی نہضت خواہند فرمود۔ مخفی نہ ماند کہ جہاز دخانی از مخترعات این فرقہ است و تیزمی رود چنانکہ بارہا جہاز ہائے دخانی از کلکتہ تا الہ آباد بہ دو ہفتہ رسیدہ اند۔

(ستمبر کے مہینے میں کہ اس کے شروع ہونے میں سترہ اٹھارہ دن باقی ہیں، دفتر بھی دریا کے راستے روانہ ہو جائے گا اور اکتوبر کے آخر میں لارڈ صاحب بھی ڈاک کے ذریعے، یا دخانی جہاز سے کوچ کر جائیں گے۔ واضح رہے کہ دخانی جہاز اس جماعت کی ایجاد ہے، یہ تیز رفتار ہے، چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دخانی جہاز کلکتے سے الہ آباد، دو ہفتے میں پہنچتے ہیں)‘‘

خط نمبر ۳۳؍میں ایک بار پھر الہ آباد کا ذکر کرتے ہیں۔

’’شخصے از خواجہ تاشان راقم یعنی بہ بندۂ از بندگان در دولت بہ کوتوالی چبوترہ رفتہ بہ شحنۂ شہر کہ با راقم نا آشنا است، از جانب جناب ۔۔۔ کہ اگر تا بنارس قرار یابد خوشتر، ورنہ تا الہ آباد فرمان رساند۔

(راقم کے خواجہ تاشوں میں سے کوئی شخص، یعنی آپ کے در دولت کے ملازموں میں سے کوئی ملازم، چبوترے

کوتوالی جا کر شحنۂ شہر سے جو مجھ سے نا آشنا ہے،
جناب کی جانب سے۔۔۔کہ اگر بنارس تک طے ہوتو
بہتر ہے، ورنہ الہ آباد تک کا حکم دے دے)''

خط نمبر ۳۵ رمیں بھی الہ آباد سے اپنی ناراضگی کا اظہار یوں کرتے ہیں ۔

''حضرت قبلہ گاہی، مدظلہ العالی! مکتوبی برائے روانگی
کلکتہ می رسد۔ یکے از خواجہ تاشان من فرمان رود کہ
این را بکدۂ ڈاک برساند ومحصول سر بسر گذاردہ
،رسید بہ ستاند۔ شبانہ غالب کہ جذبۂ شوق مرا بہ پای
بوس خواہند رسانید۔زیادہ تسلیم، گوی الہ آباد، چون
طاقت من درین مرحلہ تمام شد۔''

(حضرت قبلہ گاہی، مدظلہ العالی! کلکتہ بھیجنے کے لئے
ایک خط ارسال کر رہا ہوں۔میرے خواجہ تاشوں میں
سے کسی کو یہ حکم دیا جائے کہ اس کو ڈاک خانے پہنچا
دے اور محصول ادا کر کے رسید لے لے۔قوی امید
ہے کہ میرے جذبۂ پابوسی کو پہنچا دیں گے۔زیادہ
تسلیم، الہ آباد۔ چونکہ میری طاقت اس مرحلے پر تمام
ہوچکی ہے)''

الغرض غالبؔ نے 'مہر و آزرم از طبع پیر و جوانش گم یعنی محبت اور وفا یہاں کے پیر و جوان میں ناپید ہے' کہہ کر الہ آباد کے باشندوں سے اپنی خفگی کا بھر پور اظہار کیا۔اسے ہم حالی کے اس قول پر محمول کرتے ہیں کہ مرزا راست گفتار اور صادق الہجہ تھے۔ان پر الہ آباد ورود کے چوبیس گھنٹوں میں جو گذری، مذکورہ بالا تحریر

اسی کی داستان ہے۔اسے تو بدلا نہیں جا سکتا مگر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ وہی سرزمین الہ آباد ہے جسے شہنشاہ اکبر نے شہر خوش سواد کہا۔اس کے زمانے میں الہ آباد کی ٹکسال سے نکلنے والے سکوں پر ضرب الہ آباد کے ساتھ یہ شعر ملتا ہے ؎

ہمیشہ چون زر خورشید و ماہ روشن باد
بہ شرق و غرب جہان سکۂ الہ آباد

الہ آباد ازل سے رشیوں منیوں کی دھرتی تو تھی ہی مگر شاہزادہ دارا شکوہ کی آمد سے صوفیاء کی خاصی تعداد بھی یہاں سے وابستہ ہوگئی۔ان سب نے محبت اخوت پیار اور وفا کا درس دیا۔غالبؔ کو کیا پتہ تھا کہ جس الہ آباد کو وہ مہر و وفا سے عاری قرار دے رہے ہیں، وہیں ایک صدی بعد غالبؔ شناسی کی بنیاد پڑے گی اور مولوی مہیش پرساد کے رشحات قلم سے اس کی خوشبو چہار دانگ عالم میں بکھر جائے گی۔ یہ وہی مولوی مہیش پرساد ہیں جنھوں نے خطوط غالب کی تدوین کی۔

مولوی مہیش پرساد کی ولادت ۱۹/اپریل ۱۸۹۱ء کو ضلع الہ آباد کے موضع فتحپور کایستھان، ڈاکخانہ مدارا میں ہوئی تھی۔ابتدائی تعلیم وطن میں ہی ہوئی۔۱۹۰۹ء میں مشنری ایجوکیشنل یونین، الہ آباد اور ۱۹۱۱ء میں صوبۂ متحدہ سے اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان پاس کیا جو الہ آباد یونیورسٹی کے میٹرک کے مساوی تھا۔۱۹۱۶ء میں آپ لاہور چلے گئے۔اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک عربی میں مولوی عالم فاضل کی اعلیٰ سندیں حاصل کیں۔۴/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے سنٹرل ہندو کالج میں شعبۂ عربی فارسی اور اردو کے استاد مقرر ہوئے۔جون ۱۹۵۱ء میں یہیں سے ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔آپ نے ۶۰/برس کی عمر پائی اور ۳۰/اگست ۱۹۵۱ء کو آنجہانی ہوگئے۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں مولوی مہیش پرساد کی شخصیت بحیثیت

غالبؔ شناس اہل علم وادب کے درمیان توجہ کا مرکز بنی۔ آپ کی ایک کتاب خطوط غالب ۱۹۴۱ء میں طبع ہوکر منظر عام پر آئی۔ طباعت کے اعتبار سے اس موضوع پر مولانا امتیاز علی عرشی کے مکاتیب غالب مطبوعہ ۱۹۳۷ء کے بعد یہ دوسری کتاب ہے۔ حالانکہ مہیش پرساد نے اس پر ۱۹۲۴ء سے ہی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ خطوط غالب کی ترتیب و تدوین کا خیال مولوی صاحب کو اس وقت آیا جب انھیں ان خطوط کو کلاس میں پڑھانا پڑا۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان خطوط کو غلطیوں سے پاک ہونا چاہئے۔ بس پھر کیا تھا۔ ان کی جودت طبع نے صحت متن کے ساتھ ان خطوط کے مکتوب الیہ کا تعین کیا اور تاریخی ترتیب بھی دے ڈالی۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے ۔

خطوط غالب۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے خط ، رقعے وغیرہ۔ مہیش پرساد نے مختلف ماخذوں سے جمع کر کے ترتیب دئے۔ عبد الستار صدیقی نے نظر ثانی کی۔ پہلی جلد ۱۹۴۱ء، ہندوستانی اکیڈمی، صوبۂ متحدہ الہ آباد۔

ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد نے مولوی مہیش پرساد کے مرتبہ خطوط کو ہندی میں 'غالب کے پتر' عنوان سے دو جلدوں میں چھاپا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ 'خطوط غالب' از مہیش پرساد غالبؔ شناسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے غالبیات پر دوسرے مضامین بھی لکھے ہیں۔

'خطوط غالبؔ' پر ڈاکٹر عبد الستار صدیقی صاحب نے جو اس وقت صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی تھے، ۱۸؍صفحات کا مقدمہ رقم کیا۔ اس کے آخری صفحے پر آپ لکھتے ہیں کہ اردوئے معلیٰ اور عود ہندی میں کچھ حاشئے بھی ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کو اس لئے چھوڑ دیا کہ ان میں صرف لفظوں کے معنی دئے گئے ہیں۔ جس حاشئے کے متعلق یقین ہوا کہ غالبؔ کا لکھا ہوا ہے، خطوط غالبؔ میں درج کر دیا گیا اور آخر میں (غ) لکھ دیا گیا تا کہ وہ اور حاشیوں سے ممتاز

رہے۔ باقی حاشیوں سے ضمیمے کے طور پر دوسری جلد میں بحث کی جائے گی۔ خطوط غالبؔ کے دوسری جلد کے آخر میں کچھ ضمیمے اور اشاریئے ہوں گے۔ انھیں میں ایک فہرست خطوں کی ہوگی اور اس میں ہر خط کے متعلق یہ بتایا جائے گا کہ وہ کہاں سے لیا گیا ہے۔

الہ آباد

عبدالستار صدیقی

۱۵/ مارچ، ۱۹۴۱ء

مولوی مہیش پرساد جلد اول کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں ۔

۔۔۔خوش قسمتی کہ ان میں سے بعضے خطوں کی نقلیں ڈاکٹر صدیقی صاحب کے پاس تھیں جنھیں انھوں نے رسالۂ ہندوستانی، الہ آباد (ج ۳) میں شائع کیا۔ ان سے بعض خطوں کے متن کو درست کرنے میں مدد ملی۔ ہندوستانی (ج ۴) میں بھی کئی خط ڈاکٹر صاحب نے شائع کئے تھے اور ان کے علاوہ ان کے پاس غالبؔ کے رقعوں کا ایک انتخاب ہے جسے خود غالبؔ ہی نے ترتیب دیا تھا۔ ان چیزوں سے بھی بعض خطوں کی تصحیح میں مدد ملی۔

متعدد اردو رسالوں میں غالبؔ کے خط شائع ہوتے رہے ہیں جن میں سے خاص کر ذکر کے قابل یہ ہیں۔ 'فصیح الملک'، 'اردو'، 'ہندوستانی' الہ آباد۔ میں نہایت صدق دل سے ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی کریمانہ فیاضی سے اس مجموعے میں بہت سے نئے مواد کا اضافہ ہوا لیکن میں اپنے محترم کرم فرما ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کا شکریہ اگر خصوصیت کے ساتھ ادا نہ کروں تو بلاشبہ ایک سنگین اخلاقی جرم کا مرتکب ہوں گا کیونکہ اگر وہ عملی طور سے میری حوصلہ افزائی نہ فرماتے، وقتاً فوقتاً مجھے مشورہ نہ دیتے، میرے کام کی نگرانی نہ رکھتے، مواد کی فراہمی کے علاوہ تمام

متن کی تصحیح ونظر ثانی نہایت ہی جاں فشانی کے ساتھ نہ کرتے ،میری غلطیوں کو دور نہ کرتے اور بعض ضروری حاشئے نہ بڑھاتے ،تو یہ مجموعہ جس صورت میں ناظرین کے سامنے پیش ہورہا ہے،اس صورت میں ہرگز نہ پیش ہوسکتا۔

بنارس

مہیش پرساد

جنوری ۱۹۴۱ء

الہ آباد کو ویرانہ گردان کر غالبؔ بنارس پہنچے تو وہاں کی آب و ہوا انھیں راس آ گئی۔تقریباً چھ ماہ تک وہاں قیام کیا ۔شہر بازار اور گھاٹوں کے چکر لگائے۔قیام کے تیسرے ہفتے ان کا ذہن مائل بہ ستودن کاشی ہوا۔وہ اپنے شاگرد شاہ میاں داد خان کو ایک خط لکھتے ہیں اور بنارس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسا شہر کہاں پیدا ہوتا ہے۔

عبادت خانۂ ناقوسیان است

ہمانا کعبۂ ہندوستان است

اس شعر کی رو سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان دیر ہے اور بنارس اس کا چراغ۔ بنارس پر غالبؔ اس طرح فریفتہ ہوئے کہ مثنوی چراغ دیر تخلیق ہوگئی۔ یہ ایک سو آٹھ اشعار پر مشتمل مثنوی ہے جو ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کی مکمل نشاندہی کرتی ہے۔شہر الہ آباد نے ایک بار پھر اپنی سنگمی روایت کا پاس رکھتے ہوئے بڑے انوکھے انداز میں غالبؔ کو خراج پیش کیا۔الہ آباد کے گنگا ناتھ جھا سنسکرت شودھ سنستھان کے سابق پرنسپل ڈاکٹر جگن ناتھ پاٹھک جی نے غالبؔ کی مثنوی چراغ دیر کا سنسکرت میں منظوم ترجمہ کیا ساتھ میں ہندی میں اس کا مطلب لکھ دیا۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔اسے بھی ہندوستانی اکیڈمی ، الہ آباد نے ۲۰۱۷ء میں شائع

کیا۔اس کاعنوان دیوالیہ دیپم رکھا ہے۔ چراغ دیر کا پہلا شعر ہے ۔

نفس با صور دمساز است امروز
خموشی محرم راز است امروز

اس کا ترجمہ جگن ناتھ جی نے اس طرح کیا ہے ۔

चरागे़ दैर (देवालय–दीपम)

नफ़स बासूर दमसाजस्त इमरोज़

खमोशी महरमे राज़स्त इमरोज़

अद्यानुहरत्यन्तः श्वसितं मे प्रलयदुन्दुभिध्वानम्।

अद्य रहस्यप्रलयो मम मौने वा परिस्फुरति।।

मेरी श्वास आज प्रलय काल में बजने वाली तुरही की भाँति बज उठी है, (अथवा) आज रहस्यों का प्रलय मेरे मौन में फूट पड़ने के लिए व्याकुल है।

مثنوی کا آخری شعر اور اس کا سنسکرت ترجمہ ملاحظہ فرمائیں ۔

1.नस श्वास : सूर/सूरेक़ियामत = वह तुरही, जो क़ियामत के दिन हज़्रत इस्राफ़ील फूंकेंगे (मद्दात); दमाज़ स्त, दम–अज़–अस्त, दम = श्वास कुछ भर कर फूंकना; इमरोज़ = आज, ख़मोशी = मौन, महरमे राज़ = राज़ौ, रहस्यों की क़ियामत, महा प्रत्यय। मेरा दम सूरे क़ियामत की हम आवाज़ है, बराबरी कर रहा है, रिजा (अन्तरज़ा) मौन में रहस्यों का महा–प्रलय बरपा है, वह ज़ुबान पर आने के लिए बेक़रार है। (अंसारी)

ز الّا دم زن و تسلیم لا شو
بگو اللہ و برق ما سواشو

108. ज़ इल्ला दम् ज़नो तस्लीम ला शौ
बगो अल्लाहो बर्क़ मासेवा शौ

अस्वीकृतिमङ्गीकुरू यदीति विष्वसिति हन्त सवर्त्र।
अल्लाह अल्लाह इति वद कुर्वन्यद् यस्मसात् सवर्म।।
अस्वीकार को मान ले और
इल्ला का दम लगा
अल्लाह अल्लाह कह
और इसके सिवा जो हो उसे नष्ट कर दे।

---

108. ज़ इल्ला ़ बर्के मा सवा ए शौ ़ इस शेर को पढ़ने और समझने में 'रिज़ा' साहब को दुश्वारी हुई है। उनके अनुसार इसका अर्थ है – ''इल्ला यानी इस् बात का नारा और ला यानी नफ़ी के सुपुर्द हो जा, बस अल्लाह अल्लाह कर और बाक़ी जो कुछ है उसे बर्क़ बन कर फूंक डाल।''

अंसारी साहब लिखते हैं – '' 'ला' (नफ़ी) को मान लो और इल्ला (इस बात) का दम लगाओ, अल्लाह अल्लाह करो और उसके सिवा जो है उसे फूंक दो (दिल व दिमाग़ से ख़ारिज़ कर दो)।''

नफ़ी ़ अस्वीकृति, नामंजूरी।

دیوالیہ دپسم میں ایک صفحہ پر ایک ہی شعر ہے اور مشکل الفاظ کے معنی بھی نیچے لکھ دئے گئے ہیں۔اس طرح اس مثنوی کو قاری کے لئے آسان بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ پاٹھک جی اس سے قبل غالبؔ کے اردو دیوان کا سنسکرت منظوم ترجمہ غالبؔ کاویم عنوان سے کر چکے ہیں۔افسوس ۲۰۱۷ء میں اس کتاب کی اشاعت سے پہلے جگن ناتھ پاٹھک جی سورگ باسی ہو گئے تھے۔ ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد نے دیوالیہ دپسم کی اشاعت کے ذریعے غالبؔ اور جگن ناتھ پاٹھک دونوں کو خراج پیش کیا ہے۔اتنا ہی نہیں اکیڈمی گاہے بگاہے ماہر غالبیات کو مدعو کرتی رہتی ہے اور ان کے لکچر ہوتے ہیں۔حال ہی میں کلام غالبؔ کو انگریزی میں ترجمہ کرنے والے جناب پون ورمااس سلسلے میں الہ آباد تشریف لائے اور ہندوستانی اکیڈمی نے شائقین غالبؔ کو ان سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔اس کے علاوہ دوسرے ادارے اپنے اپنے طور پر غالبؔ کو یاد کرتے ہیں۔الغرض انھیں اس شہر میں خوب پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔حمیدیہ گرلز پی جی کالج، الہ آباد سے شائع ہونے والا نقش نو کا خصوصی شمارہ غالبؔ کے نام معنون ہے۔ یہ بھی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ شہر الہ آباد غالبؔ کے لئے آج بھی مخلص ہے۔اس موقع پر مرزا کا ایک مصرعہ یاد آرہا ہے، ملاحظہ فرمائیں ؎

'کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا'

موجودہ پُر آشوب دور کے پس منظر میں کلام غالبؔ پر نظر ثانی

کورونا وائرس عالمی وبا نے انسانی صحت پر منفی اثرات ڈالے جس کا خوف پوری دنیا پر طاری ہے۔ دور حاضر نے عالمی سطح پر انسانیت کے سماجی اور ثقافتی بحرانِ نظام پر ضرب کاری کی ہے۔ قلبی اضطراب، لوگوں سے رابطے کی عدم موجودگی، ضروری اشیاء کے فقدان نے قنوطیت کے ماحول کو سرگرم کر دیا۔ لاک ڈاؤن، سماجی دوری، کوارین ٹین، اخلاقی اور سماجی زندگی کے ناگفتہ بہ حالت میں ادب ایک چارہ گر کی طرح کارگر ہوتا ہے۔ خاص طور پر شاعری ہمارے ذہن کی تازگی اور سکون کی حفاظت کی قدر کے طور پر ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ دیوانِ غالبؔ کی ورق گردانی کرنے پر میں نے کچھ غزلوں کے اشعار کی بازیافت کی۔ ان کی غزلوں کا دائرہ وسیع ہے اس لئے دو صدیاں گزر جانے پر بھی ان کے اشعار کی عصری معنویت ہے۔ غالبؔ نے ایک مشکل تاریخی دور کا مشاہدہ کیا تھا پرانا نظام اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا اور نیا نظام ابھی اپنی جگہ نہیں لے پایا تھا۔ پرانی قدریں نئے دور کی زد میں تھیں۔ غالبؔ نے ۱۸۵۷ء کی تمام خونچکاں واردات اور کیفیات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا نہایت قریب سے محسوس کیا اور اپنے ان احساسات کو شعری جامہ پہنانے کی کافی حد تک کامیاب کوشش کی۔ اس وقت حالات اور ماحول بڑے پیچیدہ تھے جس میں ایک حساس ذہن اور ذی شعور شاعر کا حالات سے متاثر ہوئے بغیر رہنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس لئے غالبؔ کی شاعری میں بھی اس وقت کے تمام سیاسی اور سماجی حالات کا منظر بڑے خوبصورت اور حقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کی مثال ملاحظہ ہو:

پروفیسر یوسفہ نفیس، پرنسپل، حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، پریاگ راج

کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کُھلا

کورونا وائرس عالمی وبا کے اثرات بہت زیادہ اور دوررس ہیں اور بطرز غالبؔ اس ذہنی کشاکش کو شدید طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

☆☆☆

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

دورانِ لاک ڈاؤن اکیلا پن اور بغیر کسی سے ملاقات کے اوقات مشکل سے گزرتے تھے۔اس پس منظر میں غالبؔ کا یہ شعر موزوں ہے:

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

خودغرضی اور ذاتی مفاد اس دور میں حاوی رہے اور اس دور میں غالبؔ کا یہ اعلان انسانیت کا درس دیتا ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

دورِ صارفیت میں کووڈ۔۱۹ انسانوں کے مادّی نظریوں پر بھی اثر انداز ہوا اور متعدد طرح کے نفسیاتی تصادم کا باعث ثابت ہوا۔اس نفسیاتی تصادم کی بہترین مثال غالبؔ کے درج ذیل شعر میں پائی جاتی ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

کووڈ۔۱۹ کے باعث روزمرہ کی زندگی میں ہزار ہا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔موت کے حادثوں میں لوگوں کی تعزیت پر لوگوں کی اپنے عزیز و اقارب کے آخری دیدار سے محرومی اور نفسی نفسی کے عالم نے تمام رسم وروایات کو بالائے طاق رکھنے پر مجبور کیا۔ افراد کو بے پایاں نفسیاتی بحران کی کیفیت سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ دلوں کی گہرائیوں میں اترنے والے مرزا غالبؔ کے وہ اشعار جن میں انھوں نے اپنے دور کے تاثرات بیان کئے تھے،ان حالات میں بھی معنویت رکھتے ہیں۔مثلاً۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے درو دیوار سا اِک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

☆☆☆

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

روایتی معمولات معدوم ہوگئے۔معاشرت میں ایک عجیب وغریب قسم کی بے چینی ، بے قراری، اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی۔

بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا ،تو مری جان، خدا ہے

☆☆☆

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کِس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

کورونا کے درمیان سماجی دوری کے تحت تمام تقاریب روک دی گئیں، تہواروں کی رونق جاتی رہی۔ ان حالات میں غالبؔ کے اپنے زمانے میں کئے گئے احساسات ہماری نفسیات کی بھی ترجمانی کرتے ہیں۔

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

لاک ڈاؤن کے دوران ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کی نوکری ختم ہو جانا اور ان کو بڑے شہروں کو خیر باد کہہ کر اپنے آبائی وطن کی طرف ہجرت کی شکل میں نئی طرح کی مصیبتیں اور پریشانیاں درپیش آئیں۔ جس نے سماج کے لوگوں کے سامنے تمام سوالات کھڑے کئے۔ یکا یک سب کچھ بند ہو گیا۔ کارخانے اور صنعتیں بند ہو گئیں مزدوروں کی دردبھری کہانیاں ملک کے کونے۔کونے میں پھیل گئیں۔ سرکار کی جانب سے عائد کردہ پابندیوں کو خود پر طاری کر لیا گیا۔ اس طرح کے حالات کا اظہار غالبؔ کے کلام میں جابجا نظر آتا ہے۔ مثلاً۔

دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں

اورنگ آباد ٹرین حادثہ اور دوسرے حادثوں میں جو زندگی اور موت کی جنگ میں اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے گویا وہ غالبؔ کی زبان میں اپنے ہمسفروں سے یہ اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ضعیف لوگوں کو کورونا وائرس سے بخار، کھانسی، گلے کی خراش جیسی دقتوں کی علامتیں آنے کے خطرات سے ان کے دلوں میں وحشت کا ماحول بن گیا۔ وہ گھروں کی چہار دیواریوں میں محدود ہو گئے۔ ضعیفی کے سبب عمر دراز لوگوں پر اس خطرے کا زیادہ ڈر طاری ہونے کے سبب اس مشکل دور میں ان کو گھروں میں رہنے کی پابندی عائد کردی گئی۔ یہ اتفاق ہے کہ مرزا غالبؔ بھی اپنے پُر آشوب دور میں ضعیف تھے اور ان کے تصورات موجودہ دور کے ضعیفوں کی کیفیات کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

☆☆☆

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور، کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرمائیں گے کیا

بین الاقوامی کشاکش میں اضافہ کے سبب بھی اس دور میں اضطراب کی کیفیت برپا ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک سے نفرت سے دوچار ہے۔ اس سلسلے میں بھی غالبؔ کے اشعار پر غور کرنا اہم لگتا ہے۔

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اِسے ناسازگاری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

کورونا کی وجہ سے جو پریشان کن حالات برپا ہیں ان سے بغیر کسی گلہ وشکوہ کے ہمّت اور حوصلے کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ترغیب غالبؔ کے ان اشعار سے لی جا سکتی ہے۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مِٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہو گئیں

☆☆☆

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیئے

☆☆☆

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کورونا کی دوا اور ویکسین کی تشویش اور تحقیق جاری ہے۔اس ضمن میں غالبؔ کا درج ذیل شعر قابلِ توجہ ہے۔

دوست گر کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری
نہ سہی لیک تمنّائے دوا ہے تو سہی

غالبؔ ذوقِ سفر کے حمایتی ہیں۔ وہ اگرچہ منزل پر نہیں پہنچتے ہیں لیکن پیچھے

لوٹ جانے کے قائل نہیں۔ غالبؔ کا پیغام اور اندیشۂ دور و دراز ہر دور میں انسانی احساسات کی ترجمانی کرتا رہے گا۔ دشوار کن مراحل میں بے بس ہو کر محض نالہ و فریاد اور الزام تراشی کی جگہ تاریکیوں میں روشنی کی لکیروں کا متلاشی ہے۔ صبر و تحمل سے مشکلات کو آسان بنانے کا سبق غالبؔ کے کلام سے سیکھا جا سکتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ آزمائش جلد ختم ہو۔ المختصر تمام تر تردد کے باوجود ہم پُر امید ہیں۔ اس وبا کے مہلک اثرات جلد ختم ہونگے اور انشاءاللہ زندگی کے ہر شعبے میں ارتقا کی منزلیں ہموار ہونگی۔ اپنی بود و باش، طرز معاشرت اور فکر و نظر کے زاویوں میں تبدیلی لائیں گے، عبرت کے لمحے دور ہونگے۔ اس ضمن میں غالبؔ کے درج ذیل اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اے پرتوِ خورشید جہاں تاب! ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

☆☆☆

بس، ہجوم ناامیدی، خاک میں مل جائیگی
یہ جو اک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

☆☆☆

گھر میں تھا کیا، کہ تیرا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

☆☆☆

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو اک نقش پا پایا

☆☆☆

غالب کے تلامذۂ میرٹھ: اسمٰعیل میرٹھی کا تصورِ علم

یہ بات انسانی فطرت اور جبلت میں شامل ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ یہ تلاش اور کمال فن کی خواہش کو بروئے کار لانے میں وہ اپنی تمام تر قوت اور طاقت کو برمحل استعمال کرتا ہے۔ سیکھنے اور سکھانے کے عمل نے مختلف، متعدد طریقے، انداز رائج کئے ہیں۔ تخلیق کار بھی اپنی بہترین صلاحیت کی جلوہ نمائی کا خواہاں ہوتا ہے اور داد و تحسین کا متمنی۔ ساتھ ہی وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول سے زبردست اثر قبول کرتا ہے جس کی غمازی اس کے قلم کی نگارشات سے عیاں ہوتی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی ہے۔ اس احساس اور اثر پذیری نے متعدد رنگ و انداز نظر آتے ہیں۔

اسد اللہ غالبؔ کی شخصیت کا اہم اور پروقار پہلو یہ بھی ہے کہ ان سے اثر قبول کرنے والوں کی تعداد بھی وسیع ہے۔ کسی نے ان سے براہ راست اثر قبول کیا تو کوئی بالواسطہ متاثر ہوا۔ کسی نے غالبؔ کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی تو کسی نے دور سے ہی اس کے اثر سے محظوظ ہونے کا لطف اٹھایا۔

اردو شعر و ادب جہاں فارسی کی مرہونِ منت ہے وہیں اردو میں استادی اور شاگردی کی یہ روایت اس کی دین ہے۔ بقول مالک رام:

> ''شاعری میں با قاعدہ استادی شاگردی کا سلسلہ فارسی کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔ اردو نے جہاں اور کئی چیزیں فارسی سے مستعار لیں۔ وہیں یہ رسم بھی لی'' [1]

استاد کا مقصد اپنے شاگردوں کو ماہر فن بنانا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ ان کے ساتھ کڑی محنت کرتا ہے۔ ان کو شاعری کی باریکیاں، زبان

ڈاکٹر فوزیہ بانو، ایسوسی ایٹ پروفیسر، اسمٰعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج، میرٹھ

کی نزاکت لفظ ومعنی کی اثر آفرینی، رموز ونکات سے اچھی طرح واقفیت پر زور دیتا ہے۔غرض بہترین شعر گوئی کے تمام فنی، پہلوؤں، اصلاح کو فوقیت دیتا ہے۔تا کہ اس کے اشعار دلکش، پراثر، دیرپا اور ہر قسم کے نقص و کمی سے آزاد ہوں۔ ایک کامیاب استاد کے شاگرد اپنے مخصوص طرز سخن کے شہسوار ہوتے ہیں۔اور اپنی شاعرانہ اور خلاقانہ صلاحیت سے اپنا منفرد مقام بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ تلامذہ غالبؔ مخصوص لب ولہجہ کے شاعر ہیں۔بقول مالک رام:

> ''آپ دیکھیں گے کہ غالب کے شاگردوں میں بہت کم اپنے استاد کے رنگ میں کہنے والے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ غالب اس نکتنے کو خوب سمجھتے تھے کہ چہرے مہرے کی طرح ہر شخص اپنا مزاج اور مذاق بھی قدرت کی طرف سے لے کر آتا ہے۔ان میں سے کسی کو بھی بدلنے کی کوششیں کرنا، اسے مسخ کرنے کے مترادف ہے۔صحیح طریقہ یہ ہے کہ شاگرد کے کلام کے ظاہر درو بست اور فنی ولغوی اسقام کی اصلاح کی جائے ۔لیکن اس کے طرز سخن کو جوں کا توں قائم رہنے دیا جائے،تا کہ اس کی انفرادیت پختہ ہو جائے، اس کا نتیجہ ہے کہ ہمیں غالب کے شاگردوں میں اتنے زیادہ صاحب طرز شاعر ملتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا رنگ الگ ہے۔اپنی اپنی جگہ ایک ایک پختہ اور صاحب فن استاد ہے۔'' ۲

یہ غالبؔ کی ذات کی جادوگری ہے، ان کے فن کی خوبی ہے۔ ان کی

خلاقانہ صلاحیت کی انفرادیت ہے کہ ان سے فیض حاصل کرنے والوں کی فہرست طویل ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں شہر میرٹھ کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ جدوجہد آزادی کی پہلی کوشش کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا۔ سیاسی سماجی نقطہ نظر سے الگ علمی و ادبی نقطۂ نظر سے اس شہر کی خاص پہچان رہی ہے۔ ہر دور میں شعراء، ادباء نثر نگار تذکرہ نگار، فکشن نگار وغیرہ نے اردو شعر و ادب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس تاریخی شہر سے کئی علمی و ادبی جرائد و رسائل نے اردو صحافت کی تاریخ میں بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ غرض مختلف شعبوں میں اولیت حاصل کرنے والے اس شہر کے شاعر اردو کے عظیم مقبول بلند یا منفرد و ممتاز شاعر سے فیض حاصل کیا اور اس کے تلمذ کے فخریہ احساس سے سرشار ہوئے۔

شاگردانِ غالب میرٹھ میں محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کو بھی خاص بلند مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ یہ شیفتہ کی خوش نصیبی ہے کہ قیام میرٹھ کے وقت انھیں غالبؔ کی خدمت کا موقع حاصل ہوا اور ساتھ ہی ان سے کسب فیض بھی حاصل کرنے کی بھی سعادت نصیب ہوئی۔ یہی نہیں شیفتہ کی خوش بختی یہ بھی ہے کہ غالب ان کی بے پایاں سخن سنجی کے معترف بھی تھے۔

''نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم اگر چہ مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ جب تک مومن خاں مرحوم زندہ رہے انھیں سے مشورۂ سخن کرتے رہے لیکن خاں موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونوں زبانوں میں وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد ان کے معاصرین میں سے کسی کی فارسی غزل ان کی غزل سے لگا نہیں کھاتی تھیں اور شعر کا جیسا صحیح مذاق ان کی طبیعت میں پیدا کیا تھا ویسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا

معیار جانتے تھے اور ان کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی نظر سے گر جاتا تھا اور ان کی تحسین سے اس قدر بڑھ جاتی تھی یہی وہ شخص ہے جن کی نسبت مرزا غالبؔ فرماتے ہیں:

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ازرش کہ اُونوشت در
دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش فکرو' ۴۳

''نامور عالم دین، صوفی منشی بزرگ شاعر عبدالسمیع بیدلؔ نے زندگی کے طویل بیالیس سال میرٹھ میں گزارے۔ سہارنپور کے اس باشندے نے میرٹھ میں سکونت اختیار کی اور یہیں کی مٹی میں مدفون ہوئے۔ انھوں نے بھی غالبؔ سے فیض حاصل کیا۔ بیدلؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی بعد ازاں مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے استفادہ کیا۔ اور بالآخر ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳۔۱۸۵۴) میں مزید کسب علم کی غرض سے دلی کا رخ کیا۔ یہاں اس وقت دہلی میں مولوی امام بخش صہبائی اور صدر الصدور مولوی صدرالدین آزردہ کا طوطی بولتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے فارسی کی تعلیم صہبائی سے کی اور عربی اور حدیث و تفسیر آزردہ سے قیام دلی کے زمانے میں شعر و شاعری سے رغبت پیدا ہوئی تو مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی شاگردی اختیار کر کے اردو میں شعر کہنے لگے۔'' ۴۴

بیدلؔ نے غالبؔ کی شاگردی اختیار کی لیکن ان کو نعت سے بہت شغف تھا۔ رفتہ رفتہ ان کا رجحان نعتیہ شاعری کی طرف مائل ہو گیا اور ان کی شاعرانہ کلام و جوہر اسی صنف میں جلوہ افروز ہوئے۔

حکیم محمد فصیح الدین رنج میرٹھی نے اپنی شاعری کا آغاز نعتیہ شاعری سے کیا۔ آپ کو غالبؔ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ عبدالصمد میرٹھی کا شمار میرٹھ کے عمائد میں ہوتا ہے۔ پہلے ذوق سے اصلاح سخن کی ان کے بعد غالبؔ کے شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ حکیم غلام مولیٰ عرف مولا بخش قلق میرٹھی کے کلام پر غالبؔ نے اصلاح دی تھی۔

محمد اسمٰعیل میرٹھی کو بھی غالبؔ کے شاگرد ہونے کا فخر اور اعزاز حاصل ہے۔ ان دونوں کی ملاقات کے بین ثبوت نہیں ملتے۔ غالبؔ کے سفر رام پور میں میرٹھ کے قیام میں اسمٰعیل میرٹھی غالبؔ سے فیض حاصل نہیں کر سکے۔ پہلے سفر میں شفیتہ کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ اس وقت اسمٰعیل میرٹھی کی عمر سولہ سال تھی اور انھوں نے شعر گوئی شروع نہیں کی تھی دوسرے سفر رامپور میں غالبؔ کا قیام میرٹھ میں نہیں ہو سکا۔ اس لیے ان دونوں کی براہ راست ملاقات کا کوئی موقع نہیں تھا۔

> ”بعض حضرات کو اسمٰعیل کے تلمذ غالب میں بھی شبہ ہے۔ میں جن ایام میں تلامذہ غلاب کی تدوین کے سلسلے میں سرگرداں تھا میرا میرٹھ جانا بھی ہوا تھا۔ میں بار ہا اسمٰعیل کے صاحب زادے جناب محمد اسلم سیفی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ ایک دن ہم دونوں گھر سے باہر نکل رہے تھے اور وہ صحن میں رک گئے اور کہا” ابا مرحوم نے اسی جگہ کھڑے ہو کر مجھ سے کہا تھا میں نے

مرزا غالب سے اصلاح کی ہے۔ حسرت موہانی نے
بھی اسمٰعیل کو غالب کا شاگرد لکھا ہے۔ حسرت کے
اسمٰعیل سے ذاتی تعلقات تھے۔'' ۵

اسمٰعیل میرٹھی بچوں کے لئے اپنی تمام تر شاعرانہ اور خلاقانہ صلاحیت کو بروئے کار لائے۔ غالب شناسی، غالب فہمی، غالب سے مختلف عقیدت کا اظہار اسمٰعیل میرٹھی کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔ جہاں انھوں نے غالب کی طرح پر غزلیں کہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں:

کام اگر حسب مدعا نہ ہوا
میرا چاہا ہوا، برا نہ ہوا

......☆......

نقاب حور میں جوش، اک لطف نہاں نکلا
دوسرے حال پر مجھ سے بھی زیادہ مہرباں نکلا

......☆......

عارض روشن پر جب زلفیں پریشاں ہوگئیں
کفر کی گمراہیاں ہم رنگ ایماں ہوگئیں

اسمٰعیل میرٹھی کا شمار نئی نظم کے معماروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے نظیر میں نسبت کے تجربے کیے، انگریزی نظموں کا اردو ترجمہ بھی کیا متعدد صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور اپنی شاعری کے جوہر ان اصناف میں پیش کیے اور اپنا لوہا منوایا۔ اسمٰعیل میرٹھی نے وقت کے تقاضے کو محسوس کیا اور بچوں کے ذریعہ بڑوں تک اپنے مقصد کو ہونچانے کی کامیاب کوشش کی۔ انھیں صرف بچوں کا شاعر کہنا ان کی عظمت کے منافی ہے لیکن انھوں نے ان معصوموں کے ذریعہ ہی بڑوں کو نصیحت دے دی۔ انھیں حقیقت کی دنیا سے روشناس کرایا۔ اور عمل پیہم کے لیے حوصلہ افزائی کی۔

بچوں کے لیے آزاؔد سے لے کر اقباؔل تک بیشتر ادیبوں نے لکھا۔لیکن بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی مانند بطور خاص بچوں کے لیے لکھ کر اس میں کمال ہی پیدا نہ کیا بلکہ اپنی مثال آپ ہوگئے۔شاید اسی لیے شبلی نے یہ کہا:

''حالی کے بعد اگر کسی نے سننے لائق کچھ کہا ہے تو وہ
مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔'' ۶

اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اسمٰعیل میرٹھی نے علم حاصل کرنے کو سب سے زیادہ ترجیح دی۔معزز اور پروقار زندگی گزارنے پر زور دیا۔انھوں نے نے بچوں کی نفسیات کا غائر مطالعہ کیا۔ان کے عمدہ اخلاق،قوت عمل،محنت اور جہد مسلسل کو کامیابی و کامرانی کی بنیاد قرار دیا۔جس پر تہذیب و ثقافت،کردار و اعمال کا بلند و بالا ایوان تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کو غالبؔ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تو دوسری طرف قدرت نے سر سیّد سے فیض اٹھانے کا بھی موقع فراہم کیا۔اس میں کوئی دورائے نہیں اسمٰعیل میرٹھی سر سیّد کے خوشہ چینوں میں ہیں۔۱۹۰۹ء میں مدرسہ بنات المسلمین کی بنیاد اس کی زندہ مثال ہے۔ان کا خطاب بچوں سے تھا۔معاشرے میں خوش نما تبدیلی کی آواز بچوں تک صاف ستھرے،آسان اور پر اثر طریقے سے پہونچائی۔

سچ کہو سچ کہو ہمیشہ سچ
ہے بھلے مانسوں کا پیشہ سچ

......☆......

جس کو سچ بولنے کی عادت ہے
وہ بڑا نیک با سعادت ہے

وہ بچوں کو تہذیبی،اخلاقی انسانی روایات سے باخبر رکھنے کی پر زور کوشش کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

بد کی صحبت میں مت بیٹھو اس کا ہے انجام برا
بد نہ بنے تو بد کہلائے بد اچھا بدنام برا

......☆......

چھری کا تیر کا، تلوار کا تو گھاؤ بھرا
لگا جو زخم زباں کا رہا ہمیشہ ہرا

اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے انھوں نے علم کی شمع فروزاں سے ہر ایک کو فیض یاب ہونے کا موقع فراہم کیا:

علم سیکھو سبق پڑھو بچوں
اور آگے بڑھے چلو بچوں

......☆......

دل سے محنت کرو خوشی کے ساتھ
نہ اکتا خامشی کے ساتھ

بچوں کا بنیادی مقصد، ان کی تمام تر توجہ علم حاصل کرنے پر مرکوز ہونی چاہئے۔

اے پیارے بچوں تم یاد رکھو
مکتب سے نکلو لکھ اور پڑھ کر

ان کا خاص مقصد اک خوابیدہ قدم کو بیدار کرنا تھا۔علم اور حصول علم کے لیے وہ بچوں کو ہر طریقے سے راضی کرنا چاہتے ہیں۔بچوں سے تخاطب آسان اور پر اثر انداز میں کرتے ہیں۔ان کو روشن مستقبل کے وہ سنہرے دور سے روشناس کراتے ہیں۔یہ کام مشکل ضرور تھا لیکن اپنے مشن اور مقصد کے لیے انھوں نے کسی بھی کوشش کو کامیاب بنانے کا بیڑا اٹھایا:

یہ مانا کہ مشکل بہت ہے سبق
بڑا ہے مگر اضطراب اور قلق
دور بارہ پڑھو پھر پڑھو ہر ورق
پڑھے جاؤ جب تک ہے باقی سبق
کیئے جاؤ کوشش مرے دوستو
اگر طاق میں تم نے رکھ دی کتاب
تو کیا دوگے کل امتحان میں جواب
نہ پڑھنے سے بہتر ہے پڑھنا جواب
کہ ہو جاؤ گے ایک دن کامیاب
کیئے جاؤ کوشش مرے دوستو

اسمٰعیل میرٹھی ایک ماہر نفسیات کی طرح بچوں کی ذہن تک رسائی کرتے ہیں۔علم کے ذریعہ وہ ایک زندہ قوم کہلانے کے قابل ہوں گے۔اس سے مزین ہوکر ہی وہ اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتے ہیں۔ان اشعار کے ذریعہ وہ جوش عزم اور ولولہ بھرتے ہیں:

آبا نے کیا فتح جو بنگال و دکن کو
تسخیر کرو تم عمل و علم کے فن کو

دنیا میں اسی قوم کا گلزار ہے پھولا
جو رکھتی ہے دانش میں ہنر میں ید طولیٰ

اسمٰعیل میرٹھی اپنے اس بلند و بالا مقصد کی تکمیل کے لیے انھیں ہر حال میں علم و ہنر سے آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ان کی ابتر حالت دیکھ ان کا دل کچھ اس انداز میں

آنسو بہاتا ہے:

یہ بچے جو پھرتے ہیں آوارہ جاہل
گھسٹتے ہیں کانٹوں پہ گل ہائے خنداں
انھیں پر ہے موقوف اعزاز ملت
بناؤ انھیں جلد زیب دبستاں
ہنر ہائے کسب معیشت سکھاؤ
کہ ان کو ستائیں نہ سگ اور درباں

اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہر بچے کو کتابوں سے محبت کرنا سکھایا۔ انھوں نے بچوں کو کھلونے کے طور پر کتابیں پڑھنے کا خواب دیکھا۔ انھوں نے ہر ایک بچہ کی انفرادی صلاحیت و خوبی کو درجۂ کمال تک پہونچانے کا عزم کیا۔ بچوں کو علم کی دولت سے سرشار ہونے کا تصور کیا۔ بچوں کو عزت، روشنی اور بلندی پر فائز ہونے کی اہمیت ثبت کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ غرض ان کی زندگی اور شاعری کا محور اور مقصد ان معصوم بچوں پر تھا جن کے نازک کاندھوں پر ایک نئے دور کی زمہ داری خود بخود عائد ہو جاتی ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی اپنے مقصد اور حصول کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ بلاشبہ اسمٰعیل میرٹھی منفرد عالم اور معلم ہیں۔

حواشی:

۱۔تلامذۂ غالب	مالک رام	صفحہ۱۵۔۱۴
۲۔ //	//	صفحہ۱۵
۳۔یادگار غالب	الطاف حسین حالی	صفحہ۱۰۲
۴۔تلامذۂ غالب	مالک رام	صفحہ۸۵
۵۔تلامذۂ غالب	مالک رام	صفحہ۴۵
۶۔اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	ڈاکٹر سلیم اختر	صفحہ۳۵۲

❑❑❑

شخصی مرثیہ گوئی اور غالبؔ

اردو میں شخصی مراثی کی انتہائی قدیم اور جاندار روایت موجود ہے۔ابتدا سے ہی قطعہ تاریخ اور متفرق اشعار کی صورت میں، بہت سا ایسا کلام نظر آتا ہے، جس میں کسی کی موت کا براہ راست یا بالواسطہ ذکر کیا گیا ہے، لیکن اگر صرف مسلسل اور مکمل شخصی مرثیے کی بات بھی کی جائے تو بھی سولھویں صدی کے تیسری چوتھائی سے ہی اس کے نمونے ملنے لگتے ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ سلسلہ پروان چڑھتا گیا۔اردو میں دریافت شخصی مرثیوں میں سب سے قدیم، شاہ برہان الدین جانمؔ کا مرثیہ ہے، جوانھوں نے اپنے والد شاہ میراں جی کی وفات (970ھ مطابق 1562) پر نظم کیا تھا۔اس کے بعد جعفرؔ زٹلی، عبدالغفور نساخؔ، عبدالحی تاباںؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ، فقیر محمد خاں گویاؔ سے ہوتا ہایہ سلسلہ مرزا غالبؔ تک پہنچا۔

19 ویں صدی میں جن شعرا نے شخصی مرثیہ کی روایت کو طاقت اور کو رفتار دی، ان میں غالبؔ کا نام سرفہرست ہے۔اردو میں غالبؔ کے دو شخصی مرثیے ملتے ہیں۔ پہلا مرثیہ کسی معشوقہ کی موت پر ہے۔نو جوانی میں غالبؔ کو ایک ڈومنی نے موہ رکھا تھا۔حالیؔ سے لیکر حال تک، غالبؔ کے تمام سوانح نگاروں نے ان کے اس معاشقے کا ذکر کیا ہے۔خود غالبؔ کے خطوں میں ان کی اس معشوقہ اور اس کی موت کا ذکر ملتا ہے اور انھیں کی بنا پر گمان غالب ہے کہ یہ مرثیہ اسی ڈومنی کا ہے۔حاتم علی بیگ مہرؔ کو ان کی معشوقہ چنا جان کی موت پر، غالبؔ نے پرسے کا جو خط بھیجا تھا، اس میں اپنے دل کا راز یوں کھولتے ہیں:

> ''بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر
> مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں ایک ستم پیشہ ڈومنی کو

ڈاکٹر لئیق رضوی، ایڈیٹر، سہارا سمئے، دہلی

میں نے بھی مار رکھا ہے۔۔40۔42برس کا یہ واقعہ
ہے۔حالانکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا ہے۔اس فن میں بے گانہ
محض ہو گیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی
ہیں۔اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔'' 1

یہ خط 1860 کا بتایا جاتا ہے۔اس رو سے یہ واقعہ 1818 سے 1820 کے درمیان کا ہونا چاہیئے۔یہ غالبؔ کے عین شباب کا زمانہ تھا۔مظفر حسین کے نام ایک اور مکتوب میں غالبؔ اپنے محبوب کی موت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''جوانی کے دنوں میں جب میرے اعمال میرے بالوں
سے بھی زیادہ کالے تھے اور سر میں خوبصورت چہروں کا
پیار کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، بدنصیبی نے تلخی سے بھرا ایک جام
میرے سامنے بھی رکھا تھا اور دوست کے جنازے کے
غمناک منظر نے میرے صبر کو راہ کی گرد کی طرح بکھیر
دیا۔۔۔ دن کی روشنی میں کالے ماتمی کپڑے پہنے اپنی
محبوبہ کے غم میں آنسو بہاتا ہوا میں بوریے پر بیٹھا رہتا اور
رات کے اندھیرے میں غموں اور تنہائی میں، میں اس کی
بجھی ہوئی شمع کے اردگرد گھومنے والے پروانے کی طرح
آگ میں جلتا رہتا۔کیسی کھلی نا انصافی ہے کہ اس
خوبصورت بدن کو مٹی کے حوالے کرنا پڑا۔'' 2

غالبؔ نے، نہ اپنے ان خطوں میں اور نہ ہی اس مرثیہ میں مرنے والے کی شخصیت ظاہر کی ہے۔نام کا پردا بھی رکھا ہے لیکن اشعار میں گھلا درد اس سے غالبؔ کے بے پناہ لگاؤ کا آئینہ دار ہے۔12 اشعار

پر مشتمل اس مرثیہ میں بلا کی تڑپ ہے۔ اشعار سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ غالباً رسوائی کے خوف میں اس گمنام معشوقہ نے موت کو گلے لگا لیا تھا۔ غالبؔ کا دوسرا مرثیہ، زین العابدین عارفؔ کی وفات پر ہے۔ عارفؔ، غالبؔ کی بیگم امراو بیگم کے بھانجے تھے۔ اپنی اولاد سے مایوسی کے بعد کو غالبؔ نے عارف کو ہی بیٹا بنا کر اپنی زندگی کی ساری امیدیں ان سے وابستہ کر لی تھیں مگر عارف کی اچانک موت نے غالبؔ کی امیدوں کا یہ چراغ بھی گل کر دیا۔

حالیؔ لکھتے ہیں:

''زین العابدین عارف سے مرزا کو غایت درجے کا تعلق تھا۔ کچھ قرابت کے سبب اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے اور باوجود پرگوئی کے نہایت خوش گو تھے۔ ان کو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اسی لئے جب وہ جوان عمر فوت ہو گئے تو مرزا اور ان کی بی بی پر سخت حادثہ گزرا۔ مرزا نے ان کے مرنے پر ایک غزل بطور نوحہ لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے۔''3

زین العابدین عارف کی صحیح تاریخ وفات نہیں معلوم۔ حالیؔ نے لکھا ہے کہ یہ غدر سے چند سال پہلے کا واقعہ ہے۔ جبکہ غلام رسول مہرؔ کی تحقیق کے مطابق عارف نے 1848 میں انتقال کیا۔4 پون کمار ورما نے 1852 لکھا ہے۔5

ان کے علاوہ غالبؔ کے دو فارسی شخصی مرثیوں کا بھی پتہ ملتا ہے۔ مرزا غالبؔ، اپنے وقت کے نامور شیعہ عالم دین سید العلما سید حسین ابن دلدار حسین غفران

مآب کا بہت احترام کرتے تھے۔ان کی وفات (18 اکتوبر 1860) پر غالب نے درد ناک مرثیہ کہا۔ترکیب بند میں کہے گئے اس مرثیے میں 84 اشعار ہیں:

زیں خرابی کہ در جہاں افتاد　　بگزر از خاک کا سماں افتاد

چشم و دل غرق خون یکدگر است　　زین کشاکش کہ درمیاں افتاد

گشت داغ غم حسین علی

تازہ در ماتم حسین علی

فارسی میں دوسرا مرثیہ غالب نے اپنے کسی دوست کے بیٹے بابو برج موہن کی موت پر نظم کیا تھا۔دوست کے اصرار پر پہلے تو غالب نے ہرگوپال تفتہ سے یہ مرثیہ نظم کرنے کو کہا تھا۔آسانی کے لئے مثنوی کی بحر میں ایک شعر (برم چوں نام بابو برج موہن۔چکد خون دل ریش از لب من)6 بھی کہہ بھیجا تھا۔تفتہ نے مرثیہ کہہ کر بھیجا مگر اس دوران غالب نے بھی 22 اشعار کا مرثیہ کہہ لیا تھا۔7 حالانکہ مہر نے اس مرثیے کے اشعار نقل نہیں کیئے ہیں۔گمان ہے کہ ان فرمائشی اشعار کو غالب نے اپنا نام نہ دیا ہو۔

اردو میں غالب کے دونوں شخصی مرثیے، جذبے کی شدت اور پیشکش کے تعلق سے خاصے کی چیز ہیں۔ان میں غزل کی روایتی فضا ہے مگر سوگواری کے ساتھ۔غزل میں ہجر و فراق کے مضامین تو عام ہیں، لیکن یہ معشوق کی موت کا ماتم ہے۔یہ شخصی مرثیے کا نیا چہرہ تھا۔رثائی احساس میں ڈوبی یہ غزلیں، شخصی مرثیہ کی کسوٹی پر بھی کھری اترتی ہیں ان کی لفظیات اور شعری نظام بھلے ہی غزل کا ہے لیکن روح مرثیہ کی ہے۔غالب سے پہلے مصحفی اور گویا نے بھی غزل کے فارم میں شخصی مرثیہ کہا ہے، لیکن غالب پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے تغزل کو مرثیہ سے اس طرح جوڑا کہ غزل کا حسن بھی باقی رہا اور مرثیہ کی روح بھی متاثر نہیں ہوئی۔ایک مرکزی خیال اور تسلسل کے باوجود، نہ ان

میں نہ نظم کا آہنگ ہے اور نہ بیانیہ کا انداز۔ ہر شعر ایک دوسرے سے جڑا ہوا اور الگ بھی۔ کسی شعر کو ہٹا دینے یا ان کی ترتیب بدل دینے سے ان کے تسلسل اور حسن پر کوئی فرق نہیں آتا۔ ان کے شخصی مرثیوں میں تغزل بھی ہے اور رثائیت بھی۔ وہ رمزیت اور تہداری، جو غزل کا خاصا سمجھی جاتی ہے، وہ ان مراثی کا بھی طرہ ءِ امتیاز ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تار برشگال ہے نظر خو کردہء اختر شماری ہائے ہائے
ہاتھ ہی اس تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالبؔ قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

تغزل کے پرتو مومنؔ کے مرثیے میں بھی نظر آتے ہیں، لیکن غالبؔ کے یہاں یہ رنگ زیادہ چیخ ہیں۔ انھوں نے اپنے غم کو تغزل کے سانچے میں ڈھال کر، شخصی مرثیہ گوئی کو نیا اسلوب دیا۔ شکوہ، غالبؔ کے شخصی مرثیوں کا غالب رنگ ہے۔ شکوہ، فلک سے بھی اور ہمیشہ کے لئے چھوڑ جانے والے سے بھی۔ یہ اشعار بے ساختہ ہیں۔ نہ کوئی بناوٹ اور نہ کوئی تکلف۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے زندگی کے بیچ راستے میں لٹ جانے والا کوئی ناچار مسافر، اچانک فریاد کر اٹھا ہو۔ ان میں بلا کی شدت اور کاٹ ہے۔ غالبؔ اپنے اشکوں کو اشعار میں یوں گوندھتے چلے گئے ہیں کہ درد و غم کی ایک لڑی تیار ہو گئی ہے:

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ　　تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخواری کا تجھ کو آیا تھا خیال　　دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور　　تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف　　کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے　　کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

ان مرثیوں میں جذبہ کی لئے بہت شدید ہے۔ غالبؔ نے بین کا، شعوری انتظام تو نہیں کیا ہے، لیکن حسرت و یاس کا برجستہ اظہار اور بچھڑ جانے والے سے ان کے جذباتی تخاطب نے، ان اشعار میں وہ درد پیدا کر دیا ہے، جو مرثیے کی جان ہے اور پہچان بھی۔ اشعار میں یہ درد پیدا ہی نہیں ہو سکتا، اگر شاعر خود ان کیفیتوں سے نہ گزرا ہو۔ یہ درد کی زندہ اور بولتی ہوئی تصویریں ہیں۔ ان موتوں نے غالبؔ کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ غالبؔ کے وہ آنسو ہیں جو اشعار میں ڈھل گئے:

گل فشانی ہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا　　خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی　　یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے　　کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

غالبؔ کے ان اشعار میں زبردست کیفیت اور اپیل ہے۔ اس سے پہلے شخصی مرثیوں میں یہ فنی پختگی نظر نہیں آتی۔ یہ شاعر کا ذاتی غم ہے لیکن فنکارانہ اظہار نے ان مرثیوں کا دائرہ وسیع کر دیا ہے اور قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس میں صاف اور سچی تصویریں ہیں۔ خود اور اپنی زوجہ سے عارف کی خفگی کا اظہار کرتا ہوا یہ شعر اس کی

زندہ مثال ہے:

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیر سے لڑائی بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

شخصی مرثیہ نگاری کے باب میں غالبؔ نے وصف نگاری کے حسین گل بوٹے بھی سجائے ہیں، مگر غزل کی پاسداری کے ساتھ۔ یہ اشعار دیکھئے:

شرم ورسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں ختم ہے الفت کی تجھ پہ پرداداری ہائے ہائے

خاک میں ناموس پیمان محبت مل گئی اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے

اپنے شخصی مرثیوں میں غالبؔ نے زندگی اور موت کی حقیقیت کو بھی اپنے انداز میں آواز دی ہے۔ وہ، مرنے والے بیچ راستے ساتھ چھوڑ جانے والا بے وفا کہتے ہیں، فلک سے اس کی موت کا شکوہ بھی کرتے ہیں، لیکن انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہر موت کا ایک دن معین ہے۔ لیکن موت کی اس حقیقت کو انھوں نے جس طرح انسان کی بے چارگی کے رنگ میں یوں پیش کیا ہے کہ دل بھر آتا ہے:

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

درد بھری ردیفوں نے، غالبؔ کے شخصی مرثیوں میں مزید کیفیت پیدا کر دی ہے۔ معشوقہ کا مرثیہ تو اپنی نظیر آپ ہے۔ ہائے ہائے کی تکرار نے، ان اشعار میں بلا کا حسرت و یاس گھول دیا ہے۔ مومنؔ کا مرثیہ بھی کم وبیش اسی زمانے کا ہے۔ اس کے ایک بند میں بھی ہائے ہائے کی ردیف ہے۔ (وہ شمع مہر پرتو مہہ جلوہ بجھ گئی۔ دن رات ہے فروغ شب نار ہائے ہائے) قدیم نوحوں میں اس طرح کی ردیف (واویلا، وامصیبتا، ہائے ہائے) استعمال ہوتی رہی ہیں۔ سوداؔ کے ایک نوحہ (دیکھو چرخ کی بیدادی ہائے ہائے۔ فاطمہ ہیں آج فریادی ہائے ہائے) میں ہائے ہائے کی ردیف ملتی ہے۔ یہ تو تحقیق طلب ہے کہ یہ ردیف غالبؔ نے پہلے استعمال کی یا مومنؔ نے، لیکن یہ تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ شخصی مرثیہ میں یہ

ردیف،قدیم نوحوں سے آئی۔

غالبؔ نے شخصی مرثیے کے فن اور روایت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔آگے چلکر شخصی مرثیہ میں فکروفن کے تمام تجربے ہوئے،منظرنگاری اور کردارنگاری کے رنگ بڑھے۔جذبات کے ساتھ ساتھ اس میں فلسفہ کو بھی جگہ ملی،لیکن اپنے منفرد لب ولہجہ کی وجہ سے غالبؔ کے مرثیے،آج بھی خوداپنا جواب ہیں۔اپنے فکری اور تخلیقی رویوں سے غالبؔ نے شخصی مرثیے کو جو نہج دی،جونقش ونگارابھارے وہ آج بھی زندہ اورتابندہ ہیں۔ان کے رنگوں نے اس صنف کوحسن بخشا۔اس روایت کورفتار دی۔شخصی مرثیے پہلے بھی کہے گئے ہیں،لیکن یہ غالبؔ ہی تھے جنھوں نے اس صنف کوادب کے خاص دھارے میں شامل کیا۔ان کے دستخط نے شخصی مرثیے کواعتبار بخشا اور بعد کے شعرانے اسےایک علاحدہ صنف سخن کی طرح برتا۔

غالبؔ نے شخصی مرثیوں میں غزل کے جو رنگ بھرے ہیں،وہ اب بھی تازہ ہیں۔یہ ان کی چمک ہی ہے،جو میرانیسؔ اور شادؔ،سرورؔ،چکبستؔ اور جوشؔ کے مسدس میں کامیاب تجربوں کے بعد بھی،غزل میں مرثیہ کہنے کی للک زندہ رکھے ہوئے ہے۔ورنہ کربلائی مرثیہ تو اپنے ارتقائی سفر میں ہی مسدس میں ایسا ڈھلا کہ اب اسی کا ہو گیا ہے۔یہ غالبؔ کی جادوگری ہے،کہ ان کے بعد جب بھی غزل میں کسی کی موت کا ماتم کیا گیا،شعوری یا لاشعوری طور پران کے یہ مرثیے،چراغ راہ بنے۔شخصی مرثیے کا کوئی بھی مطالعہ غالبؔ کے ذکر کے بغیرادھورا رہے گا۔

☆☆☆☆☆

حوالے:۔

1۔عود ہندی،مطبع تیج کمار،لکھنوء1968،ص165

2۔پون کمار ورما،غالب اوران کا یگ،(ہ) ساہتیہ اکیڈمی،ص112,113

3۔حالی، یادگار غالب، دہلی اردو اکادمی، ص82,83

4۔غلام رسول مہر، غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ص41

5۔پون کمار ورما، غالب اور ان کا یگ، (ہ) ساہتیہ اکیڈمی، ص128

6۔مکاتیب غالب، ترتیب احسن مارہروی، علی گڈھ بک کمپنی، علیگڈھ، ص90

7۔غلام رسول مہر، غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ص275

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ: ظرافت کے آئینہ میں

مرزا اسد اللہ بیگ خاں المعروف مرزا نوشہ المخاطب، بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالبؔ دنیائے ادب کے درخشندہ آفتاب شہنشاہِ تغزل متانت، خطابت ظرافت بذلہ سنجی مزاج کے بے مثال پیکر ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس میں قدرت نے ایسی گونا گوں صفات اور صلاحیتیں ودیعت کی تھیں جس کا ہمسر ایک طویل وقفہ گزر جانے کے بعد بھی افقِ ادب پر نظر نہیں آتا۔ موصوف مرحوم میں علمی خصوصیات کے ساتھ شخصی خوبیاں مثلاً عاجزی، انکساری، بے باکی، صاف گوئی، بے نیازی، خودداری بھی بدرجۂ اتم موجود تھیں جس کی وجہ سے آپ ہر دل عزیز و مقبول خاص و عام تھے۔

غالبؔ کے کلام، طرز تحریر، اخلاق و اطوار و دیگر خصوصیات کا احاطۂ تحریر میں لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ان کے کلام میں جو گہرائی گیرائی و معنویت پنہاں ہے اس کی روشنی میں یہی کہنا بجا ہوگا کہ ہر کس و ناکس کے بس سے یہ بات باہر ہے کہ آپ کی شخصیت اور آپ کے کلام پر خامہ فرسائی کرنے کی جرأت کرے۔ غالبؔ کی تعریف میں جگرؔ مراد آبادی یوں رقم طراز ہیں:

لاریب کہ اس رمز سے واقف تھی تیری ذات
افسانہ ہمہ رنگ حقیقت ہمہ بے رنگ

جگرؔ مراد آبادی نے اپنے اس ایک شعر میں ایسا دلکش خاکہ کھینچا ہے جس سے ان کے کلام کی رعنائی اور ان کی ذاتی زندگی کی عکاسی پوری طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے جس انداز میں غالبؔ کی شخصیت پر نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے وہ خود میں ایک ایسا نمونہ ہے کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے:

ڈاکٹر بشریٰ بانو، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، مہیلا پی جی کالج، لکھنؤ

زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں
نطق کو سو ناز ہے تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر
شاہدِ مضمون تصدق ہے مرے اندازِ پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر
آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

چونکہ کلام غالبؔ کی مدح سرائی میں ذہن مفلوج، زبان قاصر اور قلم ساکت ہے اس لئے مندرجہ چند اشعار کے ذریعہ آپ کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھا۔ کلام غالبؔ میں بیشتر ایسے اشعار موجود ہیں جس کا مضمون اس قدر ادق ہے کہ دریائے ادب اور لسانیات کے غواص اور شناور بھی غوطہ کھاتے نظر آتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غالبؔ کے ہم عصر آپ کے اشعار سے بے رغبتی اور بے گانگی کا اظہار کرتے رہتے تھے اور اسی سبب غالب نے اپنے کلام کے متعلق کہا تھا ''شہرت شعر بگیتی بعد فن خواہد شدن'' موصوف مرحوم کی یہ پیشین گو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی چونکہ آپ کے اشعار اور شاعرانہ لیاقت سے آپ ہی کے دور میں خواص عموماً علمی اور بے گانگی کا گلہ کیا کرتے تھے اس لئے غالبؔ نے ایک اور موقع پر ان کا جواب یوں دیا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر غالبؔ کے شاگرد مولانا الطاف حسین حالیؔ نے

غالبؔ کی اشعار پر شرح ''یادگارِ غالبؔ'' نہ لکھی ہوتی تو شاید دنیائے ادب میں غالبؔ کو روشناس کرانا بہت مشکل مرحلہ تھا۔ شرح حالیؔ کے بعد نظم طبع طبائی نے دیوانِ غالب پر شرح لکھی اور بعد میں دیگر اصحاب نے مختلف شرحیں لکھیں جس کے نتیجے میں آج دیوان غالب کی مشروحوں سے تشنگانِ علم و ادب مستقل فیض حاصل کر رہے ہیں۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی شرح نے بھی دنیائے ادب میں کافی مقبولیت حاصل کی۔ جناب چشتی صاحب نے اس شرح کو اور شرح علامہ اقبال کو مرتب کرنے میں جس جگر کاوی، عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا ہے وہ ان شرحوں کی ورق گردانی سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ عام فہم آدمی کے لئے غالبؔ کو سمجھنا مشکل نہیں رہا۔

مرزا غالبؔ کی شخصیت اور ان کے کلام کا جو سب سے دلکش جاذب اور پُر لطف پہلو ہے وہ ظرافت، بذلہ سنجی، طنز و مزاح ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا اور اس میں مزاح اور ظرافت کے عناصر سرایت کر دینا ان کے لئے بہت معمولی بات تھی۔ غالبؔ کے شاعری کے نباض مولانا حالیؔ لکھتے ہیں کیا ریختہ میں، کیا فارسی میں، کیا نظم میں، کیا نثر میں باوجود سنجیدگی و متانت ان کی شوخی اور ظرافت ہے۔ شیخ محمد اکرام کے بقول ''جس خصوصیت نے ان کے اشعار کو امتیازی رنگ دیا ہے وہ مرزا کی ظرافت اور شوخی ہے۔ پروفیسر یوسف چشتی نے غالبؔ کے کلام کی بارہ خصوصیت بیان کی ہے۔ جس میں سے پانچویں خصوصیت ظرافت ہے جس میں بغرض سہولت بیان مزاح اور شوخی طعن اور طنز کو بھی شامل کر لیا ہے کیونکہ سب ایک ہی شجر کے برگ و بار ہیں بقول جناب چشتی صاحب ظرافت، شوخی، مزاح و طنز و طعن یہ سب خوبیاں ذہانت اور متانت پر موقوف ہیں۔ چونکہ غالبؔ بہت ذہین و فطین اور بذلہ سنج انسان تھے اس لئے قدرتی طور پر ان کے کلام میں یہ سب خوبیاں جمع ہو گئیں۔ ظرافت (بذلہ سنجی) ذہانت کی اعلیٰ صورت کا نام ہے۔ اس میں ادبی سنجیدگی اور جدت فکر دونوں پائی جاتی ہیں۔ چشتی

موصوف نے ظرافت اور مزاح میں تفریق کی ہے جو ایک باریک امتیازی پہلو ہے اہل علم کے نزدیک مگر عام لوگوں کی نظر میں بظاہر دونوں یکساں نظر آتے ہیں۔

مرزا غالبؔ کی شخصیت اور ان کی فنکارانہ تخلیقات پر اس زاویہ سے بھی نظر ڈالنا ضروری ہے کہ جس پر آشوب دور میں انھوں نے آنکھ کھولی اس میں مغلیہ سلطنت کی شاہانہ شوکت و دبدبہ رو بہ زوال تھا پیہم ریشہ دوانیوں کی یلغار اور معاشرے کی زبوں حالی سے امرا، رؤسا، ماہر فن وحرفت و اہل کمال کے استقلال اور ادارے اس قدر متزلزل ہو چکے تھے کہ یہ حضرات دلّی کو اپنا جائے مستقر بنانے پر قطعاً رضامند نہیں تھے، مگر غالبؔ سارے نامساعد حالات کے باوجود آگرہ سے منتقل ہونے کے بعد دلّی کو ہی مستقل جائے سکونت بنایا اور یہیں رہ کر ساری صعوبتیں نہایت خندہ پیشانی سے تا دمِ حیات برداشت کرتے رہے غالبؔ کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ جو مصائب و آلام کا کوہ گراں آپ پر وقتاً فوقتاً ٹوٹا وہ ساری فنکارانہ صلاحیتوں کو یکسر زائل کر دینے کے لئے کافی تھا۔ پانچ سال کی عمر میں آپ کے والد محترم عبداللہ بیگ خاں کا سایہ سر سے اٹھ جانا اور بعد میں مشفق چچا نصر اللہ بیگ خاں کا نو (۹) سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہنا، بھائی پر جنونی کیفیت کا طاری ہونا، پنشن کا منقطع ہو جانا اور مفلسی اور فاقہ کشی سے پے در پے دو چار ہونا یہ کچھ ایسے روح فرسا سانحات تھے جو ان کے فن کو بامِ عروج تک پہونچانے میں بالکل معاون نہیں ہو سکتے تھے مگر مرزا کے فن وفکر اور مزاج پر ان حالات کا شاید کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ کہتے ہیں کہ مفلسی اور عشرت حسن لطافت کو مٹا دیتی ہے اور مستقل دائم و قائم رہنے کی صورت میں نہ صرف فنکارانہ صلاحیت کو زائل کر دیتی ہے بلکہ فنکار کی ہنسی کو بھی فنا کر دیتی ہے۔ مگر مرزا کے معاملے میں یہ حقیقت بالکل برعکس ہے کیونکہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی ان کی

حس لطافت اس حد تک پروان چڑھی کہ ان کی نگارشات مطانت، ذہانت، متانت، تنوع، ندرت، ظرافت، بزلہ سنجی، طنز ومزاح کا ایک مرقع ہے جس کا مثل ومتبادل یکسر اردو ادب میں ناپید اور مفقود ہے۔

چونکہ مرزا غالبؔ کی نگارشات نثر، نظم وغزل، شوخی، ظرافت، بذلہ سنجی، طعن و طنز اور مزاح اور دیگر لوازم سے آراستہ و پیوستہ ہے اس لئے اس تحریر کا محور اور عنوان انھیں خوبیوں کو مدنظر رکھ کر منتخب کیا گیا ہے۔

نثری ظرافت:

زبان کے متعلق مرزا کا ایک لطیفہ یہ ہے کہ کسی نے آپ سے سوال کیا کہ دلّی میں رتھ کو بعضے مؤنث اور بعضے مذکر بولتے ہیں آپ کی کیا رائے ہے۔ رتھ مذکر ہے یا مؤنث؟ آپ نے کہا بھیا جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھے ہوں تو مذکر سمجھو۔

مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجہ غایت تھا۔ باوجود یہ کہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے مگر کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

> ’’جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراق اشعار لئے لئے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے اور نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبر سن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاح اشعار مجھے معاف کریں خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت ہو

سکے گا لکھ دیا کروں گا۔‘‘

باوجود اس کے بھی لوگ مرزا کو برابر سناتے رہتے تھے۔

ایک دفعہ جب رمضان کا مہینہ گزر گیا تو مرزا قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟ عرض کیا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔

مرزا جس مکان میں رہتے تھے جس میں ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی اور ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر لو اور گرمی کے موسم میں وہیں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جبکہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے چلے آئے۔ اس وقت مرزا صاحب اس کوٹھری میں ٹھیک اسی وقت چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے دیکھ کر کہنے لگے۔

’’ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے
میں شیطان قید رہتا ہے۔ مگر آج حدیث کی صحت میں
تردد پیدا ہوگا۔‘‘

مرزا نے کہا:۔

’’قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے، آپ کو معلوم رہے کہ وہ
جگہ جہاں شیطان قید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے۔‘‘

غدر کے دو برس بعد نواب یوسف علی خاں رئیس رام پور نے سو روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو بعد میں نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی بدستور جاری رکھا۔ جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور مرزا تعزیت کے لئے رامپور گئے چند روز بعد نواب کلب علی خاں مرحوم لفٹینٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا۔ روانگی کے وقت موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزا سے کہا ’’خدا کے سپرد‘‘ مرزا نے کہا حضرت خدا نے مجھ کو آپ کے سپرد کیا

ہے آپ پھر الٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔

مرزا کو چوسر اور شطرنج بہت کھیلنے کی عادت تھی اور جب کھیلتے تھے تو برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ چوسر کی بدولت مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا۔ یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گزرا اور اس حد تک کبیدہ خاطر ہوئے کہ آرزو کرنے لگے کہ اب دنیا میں نہ رہیں اور اگر رہیں بھی تو کہیں اور۔ مرزا تقریباً تین مہینے قید خانے میں رہے اور ان کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ بالکل قید خانے میں اسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے اور ساری ضروریات حسب دلخواہ گھر سے پہونچتی تھی اور ان کے دوست ان سے ملنے جاتے تھے۔ وہ بطور نظر بندوں کے جیل خانے میں رہتے تھے مگر چونکہ اس وقت تک شہر کے شرفا اور اعیان کے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا اس لئے وہ اس کو بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے۔ جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو کالے صاحب کے مکان پر آکر رہے تھے ایک روز میاں کے پاس آکر بیٹھے تھے کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی مرزا نے کہا ”کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں۔“

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا نہایت قلیل تھا مرزا نے مسکرا کر کہا:۔

> ”اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیا جائے تو بڑا دسترخوان
> یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو
> دیکھئے تا بایزید کا۔“

ایک دن سیّد سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے جب تھوڑی دیر ٹھہر کر جانے لگے تو مرزا خود اپنے ساتھ میں شمعدان لے کر چھوڑنے آئے تا کہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ انھوں نے کہا قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی میں اپنا جوتا آپ پہن

لیتا مرزا نے کہا:۔

''میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمع دان نہیں لایا ہوں بلکہ اس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔''

مرزا سے جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمائش جو ان سے بآسانی سر انجام نہ ہوسکتی تھی تو وہ ایسی بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت اور ناموری پر ضرب آئے گا بلکہ صاف لکھ کر بھیج دیتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔بعض اوقات ایسی فرمائشوں سے جس کو سر انجام دینے میں دقت اٹھانی پڑتی تھی بڑے لطف کے ساتھ پہلو بچاتے تھے۔مرزا تاریخ نکالنے سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔ایک دن نواب علاء الدین خاں مرحوم نے اپنے لڑکے کی ولادت اور اس کے تاریخی نام کی فرمائش کی اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

''شیر اپنے بچے کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔جب جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کرتے ہیں۔تم سخن ور ہو گئے ہو حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسمِ تاریخی کیوں نہ نکال لو؟ مجھ پیر غمزدہ دلِ مردہ کو تکلیف دو۔علاء الدین خان تیری جان کی قسم!! میں نے پہلے لڑکے کا جو اسمِ تاریخی نظم کر دیا تھا وہ لڑکا نہ جیا، مجھ کو اس غم نے گھیرا ہے کہ وہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی، میرا ممدوح جیتا نہیں، نصر اولین صدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چلے گئے۔ واجد علی شاہ

تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی
مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی
پرے پہنچا۔ ناصاحب دھائی خدا کی! میں نہ تاریخ
ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔‘‘

کسی نے امراؤ سنگھ نام کے ایک شاگرد کی دوسری بیوی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں۔ اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

’’امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے
واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ!!! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار
ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر
پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ
پھندا ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی
تیرے بچے کو میں ہی پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا
ہے۔‘‘

ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھ کر آئے۔ اس کا دیوان خانہ تو پسند آ گیا مگر محل سرا خود نہ دیکھ سکے گھر پر آ کر اس کو دیکھنے کے لئے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھ کر آئیں تو ان سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔ مرزا نے کہا کہ کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے۔

مرزا اپنی شوخی طبع سے مجبور تھے اور کسی موقع پر خوش طبعی کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش خاں معروف خسر مرزا غالبؔ جن کے تقدس اور بزرگی کے سبب ان

کے بڑے بھائی زانوئے ادب تہہ کر کے ان کے سامنے بیٹھتے تھے ان کے آگے بھی مرزا اپنی شوخی سے باز نہ آتے تھے۔ آپ لوگوں کو مرید بھی کہا کرتے اور جب بہت سے مرید ہو جاتے تھے تو ان کو اپنے سلسلے کے تمام مشائخ کا شجرہ لکھ کر ایک ایک کاپی سب کو تقسیم کیا کرتے تھے۔ انھوں نے مرزا کو شجرہ دیا کہ اس کو نقل کر دو آپ نے شجرہ کی نقل اس طرح کی کہ ایک نام لکھ دیا اور دوسرا حذف کر دیا، تیسرا پھر لکھ دیا چوتھا پھر ساقط غرضکہ ایسی بہت سے حذف و اسقاط کر کے نقل و اصل جا کر ان کے حوالے کی۔ وہ دیکھ کر بہت خفا ہوئے کہ یہ کیا غضب کیا؟ مرزا نے کہا کہ حضرت آپ اس کا کچھ خیال نہ فرمائیں۔ شجرہ دراصل خدا تک پہونچنے کا ایک زینہ ہے۔ سو زینے کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ سے نکال دی جائے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا۔ آدمی ذرا اُچک اُچک کر اوپر چڑھ سکتا ہے۔ وہ یہ سن کر بہت جز بز ہوئے اور نقل پھاڑ ڈالی اور کسی اور شخص سے اس کی نقل کرائی اور مرزا ہمیشہ کے لئے اس تکلیف سے چھوٹ گئے۔

مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم ملیں گے جس میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی بات موجود نہ ہو یہاں تک کہ رنج اور افسردگی کا بیان بھی اس ذکر سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں کہ بھائی صاحب میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸/ربیع الاوّل کو شام کے وقت میری وہ پھوپھی میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھتا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا۔ اس مرحومہ کے ہونے سے میں یہ جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرتے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج مر گئے۔ ایک ایسی ہی افسردہ تحریر میں نواب امین الدین خاں کو لکھتے ہیں ''آج تم

دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد ہوں۔

مذکورہ بالا مرزا کے وہ جوہر پارے ہیں جو ظرافت بذلہ سنجی اور مزاح سے لبریز ہیں۔ اسی طرح نظم و غزل بھی ان خوبیوں سے بھرپور ہیں جن کی چند مثالیں یہاں پر تحریر کی جاتی ہیں۔

ذات باری تعالیٰ سے بھی شوخ طبعی کا مظاہرہ کرنے میں غالبؔ بالکل نہیں چوکتے اور اس ضمن میں بھی ایسی شوخ کلامی کے نمونے موجود ہیں جن کو پڑھ کر کسی بھی سنجیدہ سے سنجیدہ شخص کو ہنسی آجائے:

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے میرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ذات باری تعالیٰ سے گلہ یہ کرتے ہیں کہ صرف فرشتوں کے لکھے اعمال کی بنا پر انسان کو سزا نہیں دی جانی چاہئے بلکہ گواہی کے لئے اپنی طرف سے بھی کوئی شخص مقرر ہونا چاہئے تا کہ مکمل انصاف ہو سکے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اس شعر میں بعد از مرگ کے منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے جو اعلیٰ درجہ کی شوخ طبعی کا نمونہ ہے۔ مرنے کے بعد بارگاہ ایزدی میں حاضر ہیں اور وہاں سے سزا کے احکام صادر ہونے والے ہیں یا صادر ہو چکے ہیں۔ از راہ تمسخر کہتے ہیں کہ جو بہت سارے گناہ میں نے کیئے نہیں ہے۔ میں اور ان کی حسرت لئے ہوئے دار فانی کو خیر باد

کہہ دیا ہے اس لئے ان نا کردہ گناہوں کی حسرتوں کی بھی داد ملنی چاہئے۔ اسی طرح کا دوسرا اشعر مندرجہ ذیل:

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

شعر میں بھی شوخ طبعی کی بہترین مثال ہے۔ کہتے ہیں کہ بعد از مرگ بغیر سوال و جواب کے نکیرین سے خلاصی غیر ممکن ہے کیونکہ گناہ اس قدر کئے ہیں کہ سزا ہونا لازم ہے۔ لہٰذا شراب پی کر رونا کہ نکیرین شراب کی بو سے ہی بھاگ جائیں اور سوال جواب کی نوبت ہی نہ آئے۔ بادہ دوشینہ تشبیہہ ہے اس شراب سے جو مرنے سے پہلے پی گئی ہو۔ چند مزید اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

کیا غرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
اپنا سیر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

چند نمونے شوخی اور ظرافت کے مرزا کی غزلیات سے:

مانا کہ تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منھ میں زبان ہے

بوسہ نہیں نہ دیجیئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو گر تم دہاں نہیں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منھ سے مجھے بتا کہ یوں

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

ایک جا حرف وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا
ظاہر اک کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک
آغوش خمِ حلقۂ زنار میں آوے

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذتِ آزار دیکھ کر

دل لگا کر ان کو بھی لگ گیا تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد یاں

مرزا غالبؔ کی شوخی اور ظرافت تا دمِ حیات قائم رہی، ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف سستی، کاہلی، گرانجانی، رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ساتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر نابرسیدہ بخش دیا تو خیر اگر باز پرس ہوئی تو سقر فقر ہے اور ہادیہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مرزا غالبؔ اور دبستانِ میرٹھ کا ادبی شعور نقد

دہلی سے محض 70 کلومیٹر دور انقلابی سرزمین 'میرٹھ' میں مرزا غالب نے اپنی زندگی کے کچھ ایام گزارے تھے۔مرزا غالب کے سب سے چہیتے شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی تمام جائداد 1857 کے غدر کے بعد انگریز حکومت نے ضبط کی تو انھوں نے اپنا مسکن میرٹھ کو بنایا۔میرٹھ میں واقع خیر نگر کی گولر والی حویلی میں شیفتہ کا قیام رہا۔اسی حویلی میں مرزا غالب نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملنے تین مرتبہ میرٹھ آئے۔لیکن مولانا الطاف حسین حالی نے ''یادگارِ غالب'' میں لکھا ہے کہ مرزا غالب نے اپنے بچپن کے کچھ دن میرٹھ میں گزارے تھے۔غالبؔ نے اپنے فارسی روزنامچے ''دستنبو'' میں بھی میرٹھ سے دہلی آئے ہوئے انقلابی فوجیوں کو ہدف کا نشانہ بنایا،ان کی نظر میں میرٹھ کے باغی فوجیوں کی وجہ سے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔میرٹھ کی ادبی فضاؤں میں غالبؔ کا نام بہت ہی احترام کے ساتھ لیا جاتا رہا ہے۔لیکن مرزا غالبؔ کی متنازعہ فارسی کتاب 'قاطع برہان' کے خلاف جب ہندوستان بھر میں کتابیں اور رسالے لکھے گئے تو میرٹھ میں بھی مرزا رحیم بیگ نے 'ساطع برہان (فارسی)'، مطبع ہاشمی، میرٹھ 1283ھ مطابق 1865 تحریر کی۔اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے کے بعد مرزا غالبؔ نے فرقانی میرٹھی کے نام خط تحریر کیا جس میں مرزا رحیم بیگ میرٹھی اور ان کے اُستاد امام بخش صہبائی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔مرزا غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ ''عودِ ہندی'' ممتاز علی خاں کی ایماں پر میرٹھ سے 1869 میں شائع کیا گیا۔میرٹھ میں ہی مرزا غالب کے کلام کی اولین شرح شوکت ''حل کلیات غالب'' (1899) لکھی گئی۔اس شرح میں مرزا غالبؔ کے ایک شعر کے چار سے زائد مطالب بیان کیے گئے۔بعد میں بیان میرٹھی نے بھی ''حل المطالب'' کے نام سے دیوانِ غالب کی شرح لکھی۔میرٹھ میں مرزا غالب کے شاگردوں اور دوستوں

ڈاکٹر ابراہیم افسر، وارڈ نمبر ا، مہپا چوراہا، نگر پنچایت سوال خاص ضلع میرٹھ

کی ایک بہت بڑی تعداد آباد تھی جنھوں نے مرزا غالب کے رنگ میں اپنی شاعری کو پروان چڑھایا۔حکیم غلام مولا قلق میرٹھی کے انگریزی نظموں کے تراجم ''جواہر منظوم'' پر مرزا غالب نے نظرِ ثانی کی، بعد میں قلق میرٹھی سے مرزا غالب کے عودِ ہندی پر تقریظ بھی لکھوائی۔مولانا اسماعیل میرٹھی نے بھی مرزا غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لی اور حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی سے مرزا غالب کے دوستانہ مراسم تھے۔مرزا غالب نے اپنے کئی خطوط میں میرٹھ سے متعلق باتوں،ملاقاتوں اور اپنے شاگردوں کا تذکرہ بڑے ہی ظریفانہ انداز میں کیا ہے۔میرٹھ سے تعلق رکھنے والے ماہرِ لسانیات شوکت سبزواری نے مرزا غالب کے فن اور شخصیت پر ''غالب فکر وفن'' اور ''فلسفۂ کلامِ غالب'' کتابیں تحریر کیں۔میں نے اس مضمون میں میرٹھ اور مرزا غالب کے حوالے سے نئی تحقیق کرنے کی مقدور بھر کی ہے۔

....

کلیدی الفاظ

میرٹھ، دہلی، غدر، انقلاب،شرح دیوانِ غالب،فوج،عودِ ہندی،حل کلیات غالب،قاطع برہان،ساطع برہان،مرزا رحیم بیگ،امام بخش صہبائی،مرزا ہرگوپال تفتہ،نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، خیر نگر، بیان میرٹھی،رنج میرٹھی، اسماعیل میرٹھی،شوکت میرٹھی،شوکت سبزواری۔

دبستانِ میرٹھ کی ادبی شان وشوکت اور اس خطۂ ارض کے جاہ وجلال ،شان وشوکت پر بات کرنے سے قبل اختر چغتائی میرٹھی کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

نازشِ عظمت ہے تو ،گہوارۂ فطرت ہے تو
جانِ شعریت ہے تو،آغوشِ حریت ہے تو
خاکِ میرٹھ! تیرے ہر ذرّے پہ نازاں کائنات
گلشنِ گیتا ہے تو ،گل دستۂ جنّت ہے تو

شاعرِ انقلاب عبدالقیوم قریشی کوثؔر میرٹھی نے اس شہر کی عظمت و تقدس اور حریت و جرأت نوازی کو اپنے اشعار میں یوں بیان کیا:

اے زمیں، اے خطۂ میرٹھ! تجھے صدا آفریں
جی میں آتا ہے کہ بڑھ کر چوم لوں تیری جبیں
حریت کے نقش ہیں تیری مُقدس خاک پر
دنگ ہے تاریخ تیری جرأتِ بے باک پر

انقلابِ ستاون اور مجاہدین غدر اور اس باشندگانِ میرٹھ کی حریت نوازی کے جذبوں کو اوم پرکاش آزاد نے خوب صورت پیرائے میں یوں پیش کیا:

یہ ستاون کے ویروں کی زمیں عزت کے قابل ہے
یہ آزادی کی دولت کی امیں عزت کے قابل ہے
جو رہ رہ کر ابھرتی ہے سدا ذہن مورخ میں
یہ میرٹھ ارض، دلنشیں عزت کے قابل ہے

شمالی ہند کا یہ تاریخی شہر قدیم زمانے سے ہی اپنی علاحدہ سیاسی ولسانی شناخت کے ساتھ ادبی وقار وافتخار بنائے ہوئے ہے۔ ''کھڑی بولی'' کے اس خاص علاقہ نے اُردو زبان وادب کی آب یاری اور فروغ میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ وطنِ عزیز کی آزادی کے لیے شہرِ میرٹھ نے لاتعداد قربانیاں بھی دیں۔ شہرِ میرٹھ کی قربانیاں اور حریت نوازی کے واقعات ہندوستانی تاریخ کے اوراق میں سنہرے حرفوں میں درج ہیں۔ اس بنا پر شہر میرٹھ کو ''عروس الاحرار'' اور ''نفیرِ آزادی'' جیسے اعزازی خطابات سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخ کے سنجیدہ قاری اس بات سے بہ خوبی واقف ہیں کہ عہدِ رامائن اور مہابھارت کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کے آثارِ قدیمہ کے نشانات آج بھی اس خطّے میں موجود ہیں۔ اُردو ادب کے اوراق پلٹنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میرٹھ کا ایک نام ''عشق آباد'' بھی تھا۔ میرٹھ شہر کی تاریخ وتہذیب پر تحقیقی کام کر رہے انیس احمد

حسینی انیسؔ میرٹھی نے اپنے غیر مطبوعہ مقالے ''میرٹھ کی کمبوہ ریاست تاریخ کے آئینے میں'' اس فصیل بند شہر کا نقشہ کچھ اس انداز میں کھینچا:

''شمالی ہندوستان کا گنگا جمنا کے دوآبے کے درمیان میں سرسبز و شاداب اور مردم خیز خِطّہ ہے جسے ماہرین لسانیات نے اُردو زبان و ادب کا گہوارہ قرار دیا ہے۔ ناقدین، محققین اور زبان دانی کے مبصرین کے معتبر بیانات کی روشنی میں میرٹھ کو ' کھڑی بولی'' کا مسکن اور اس کے نکھرے ہوئے روپ کا بنیادی علاقہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہاں کی مٹی میں اگر قومی یک جہتی کے عناصر شامل ہیں تو یہاں کی تہذیب و ثقافت میں گنگا جمنی تہذیب کے نقوش بھی روشن ہیں۔ اس انقلابی خطے نے وطنِ عزیز کی آزادی کے لیے وہ بے باکانہ، مجاہدانہ کردار ادا کیا کہ اہلِ دانش اور مفکرینِ جہاں نے اسے ''عروس الاحرار'' اور ''نفیرِ آزادی جیسے اعزازی خطابات سے نوازا۔ آریہ اور شاہی تہذیب و تمدن میں دستاویزی شان و شوکت رکھنے والا یہ تاریخی علاقہ ادب العالیہ کی قدیم روایت کا امین و ترجمان و پاسبان بھی ہے۔'' 1

جیسا کہ ماقبل تحریر کر چکا ہوں کہ دوآبہ اور سرزمینِ میرٹھ اُردو ادب کے لیے بڑی ہی زرخیز رہی ہے۔ اپنے علمی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے اس شہر کو دبستان کا درجہ حاصل ہوا۔ معاملہ چاہے شعر فہمی کا ہو یا نثری پاروں کی پرکھ کا، تنقید کا ہو یا تحقیق کا یا اُردو زبان و ادب کے فروغ کا، دبستانِ میرٹھ نے اپنے ادبی

کارہائے نمایاں سے اُردو ادب کو نئی سمت، جہت اور رفتار عطا کی۔انھیں ادبی کارناموں کی وجہ سے اُردو ادب میں اس خطۂ ارض کو منفرد مقام و مرتبہ حاصل ہوا۔انیسویں صدی میں میرٹھ کی سرزمین میں ایک سے بڑھ کر ایک شار ،شعرا،ناقدین، محققین ،مبصرین،تذکرہ نویس اور ماہرِ لسانیات نے آنکھیں کھولیں۔الغرض!اس شہر میں ادبی شعوراور ذوق وشوق ابتدا سے ہی تھا۔انیسویں صدی میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ اُردو ادب کے ساتھ ساتھ دنیائے ادب میں منفرد اور اعلیٰ مقام و مرتبہ حاصل کر چکے ہندوستان کے مایہ ناز شاعر اور نثار مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے ہندوستان کے جن شہروں مثلاً آگرہ، دہلی، الور، جے پور، لوہارو، بنارس، الہٰ آباد، بھوپال، فیروز پور، رام پور،مراد آباد،سکندر آباد، بلند شہر، کلکتہ وغیرہ کے بعد جس شہر کو عموماً اپنی زندگی کے آخری عشرے اور بالخصوص تحریروں (خطوط) میں یاد کیا وہ شہر میرٹھ ہے۔شہر میرٹھ میں اُس وقت مرزا غالبؔ کے مداحین، ناقدین اور قدر شناسوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔مرزا غالبؔ کے کلام نے شہر میرٹھ میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔مرزا غالبؔ کے اشعار کے اولین شارح مولانا شوکت میرٹھی (1839-1922) بھی یہیں پیدا ہوئے۔مولانا شوکت میرٹھی نے مرزا غالبؔ کے ایک شعر کے کئی کئی مطالب و مفاہیم اپنے پرچے''سخنۂ ہند''میں دسمبر 1893 کے شمارے سے حلِ کلیاتِ اُردو مرزا غالب دہلوی''کے عنوان سے کلامِ غالب کی شرح کا باقاعدہ ایک نیا سلسلہ شروع کر، بیان کیے۔بیانؔ میرٹھی نے کلامِ غالب کی شرح ''حل المطالب(شرح دیوانِ غالب)''کے عنوان سے اپنے ماہ نامہ رسالے''لسان الملک''میں دسمبر 1895 کے شمارے سے سلسلے وار شائع کیا۔دراصل یہ شرح شوکت میرٹھی کی شرح کلامِ غالب کے جواب میں لکھی گئی۔مرزا غالبؔ کی کتاب''قاطع برہان''کے جواب میں''ساطع برہان ''مرزا رحیم بیگ (1821-1876) نے میرٹھ میں لکھی۔مرزا غالبؔ کے تلامذہ فصیح الدین رنجؔ میرٹھی(1836-1885)،نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ(1806-1899) اور

مولوی اسماعیلؔ میرٹھی (1844-1917) کا تعلق بھی سرزمینِ میرٹھ سے تھا۔ مرزا غالبؔ کے خطوط کے پہلے مجموعے ''عود ہندی'' پر تقریظ لکھنے والے حکیم مولا بخش قلقؔ میرٹھی (1833-1880) نے بھی سرزمین میرٹھ کو اپنا کارِ جار بنایا۔ سب سے بڑی بات مرزا اسداللہ خاں غالبؔ 1857 کے ناکام انقلاب کے بعد اپنے سب سے چہیتے، ہر دل عزیز اور محسن شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ سے ملنے کے لیے میرٹھ تین مرتبہ تشریف لائے۔ دبستانِ میرٹھ کو مرزا غالبؔ کے اولین مکاتیب ''عود ہندی'' کی اشاعت کا بھی شرف حاصل ہے۔ عود ہندی کو سرزمین میرٹھ سے 27 اکتوبر 1868 میں رئیس میرٹھ حاجی ممتاز علی خاں نے ترتیب دے کر مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع کروایا۔ میرٹھ کے ادبا و شعرا کی مرزا غالبؔ سے عقیدت مندی کا حال یہ تھا کہ سید محمد مرتضیٰ بیانؔ ویزدانیؔ میرٹھی (1850-1900) نے اپنے خطوط کے مجموعے کا نام ''عودِ ہندی'' سے متاثر ہو کر احتراماً ''تیغِ ہندی'' رکھا۔ اس بات کا خلاصہ ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے اپنی کتاب ''بیان میرٹھی اور غالب'' میں کیا۔ لکھتے ہیں:

> ''تیغِ ہندی بیان کے خطوط کا مجموعہ ہے جو مخطوطے کی صورت میں ہمارے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے غالباً بیان نے یہ نام غالب کے مجموعۂ خطوط عودِ ہندی (مطبوعہ 27 اکتوبر 1868) سے متاثر ہو کر رکھا ہے۔ یہ ہمیں بیان پر تحقیق کے دوران لال کرتی، میرٹھ کے رئیس خان بہادر شیخ بشیر الدین تسخیر میرٹھی (تلمیذ بیان میرٹھی) کے چھوٹے صاحب زادے بھیا غیاث الدین صاحب (ف 1980) کے کتب خانے سے

1974 میں فراہم ہوا تھا۔''2

بیان میرٹھی نے کلامِ غالب کی شرح ''حل المطالب (شرح دیوانِ غالب)'' کے عنوان سے اپنے ماہ نامے رسالے ''لسان الملک'' میں سلسلے وار شائع کی۔ دراصل یہ شرح شوکت میرٹھی کی شرح کلامِ غالب کے جواب میں لکھی گئی۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اپنے عہدِ طفلی کے کچھ ایام میرٹھ میں گزارے تھے۔ الطاف حسین حالی کے مطابق'' چچا نصر اللہ بیگ کے انتقال کے بعد غالب اپنے نانا غلام حسین کی سرپرستی میں آ گئے جو میرٹھ کی سرکار میں فوج کے کمیدان (نائب کپتان) تھے لہٰذا کوئی وجہ نہیں غالب ان کے پاس میرٹھ میں نہ رہے ہوں''۔ مرزا غالب نے جو خطوط اپنے احباب کو لکھے ان میں بھی میرٹھ کے قیام کی باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام لکھے گئے خطوط اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ مرزا غالب جب رام پور کے سفر کے لیے گئے تو میرٹھ میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے یہاں آرام کیا تھا۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام 26 جنوری 1859 چہار شنبہ کو لکھے گئے خط میں، میرٹھ میں قیام کی وجہ اور وہاں گزارے ہوئے ایام کی تعداد کا تذکرہ دل چسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ مرزا غالب کا خط ملاحظہ کیجیے:

''صاحب!

تمھارا خط مع رقعۂ مردِ سخن فہم پہنچا۔ تمہاری خوشامد نہیں کرتا، سچ کہتا ہوں کہ تمہارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔ جواب میں درنگ اس راہ سے ہوئی کہ میں مصطفیٰ خاں کی ملاقات کو بہ سبیلِ ڈاک میرٹھ گیا تھا تین دن وہاں رہا، کل وہاں سے آیا۔ آج تم کو یہ خط بھجوایا۔''3

مرزا غالب نے یک شنبہ سوم جنوری 1859 کو مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام

لکھے خط میں میرٹھ میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملنے کے بارے میں لکھا:

''صاحب!

میرٹھ سے آ کر تم کو خط لکھ چکا ہوں ،شاید نہ پہنچا ہو،اس واسطے از روئے احتیاط لکھتا ہوں کہ نواب مصطفیٰ خاں کے ملنے کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا اور سہ شنبے کے دن دلّی آ گیا اور چار شنبے کے دن تم کو خط بھیجا۔''4

مرزا غالب، اپنے عزیز و اقارب کے میرٹھ آنے جانے اور وہاں ٹھہرنے پر نگاہ رکھتے تھے۔جب مرزا ہر گوپال تفتہ ،نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملنے کے واسطے میرٹھ گئے تو اس بات کی اطلاع مرزا غالب کو ہو چکی تھی ،جس کا تذکرہ انھوں نے مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام جمعہ، 23 دسمبر 1859 کو لکھے خط میں یوں کیا:

''تمھارا میرٹھ جانا اور نواب مصطفیٰ خاں سے ملنا ،ہم پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں۔''5

دراصل نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی جا گیر انگریز حکومت نے دورانِ غدر حفاظت نہ کرنے کے سبب، الزام عائد کر ضبط کر لی تھی اور سات برس کی سزا کا بھی حکم انھیں ملا۔شیفتہ ،انگریزوں کے اس رویے سے بہت خفا اور نالاں ہوئے۔دہلی چھوڑ کر میرٹھ میں سب سے پہلے اپنے بھتیجے داماد محمد عماد نبی خاں سنبھلی کے یہاں، پھر حاجی ممتاز علی کمبوہ کے پاس مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔یہ علاقہ چھتہ ممتاز علی، خیر نگر بازار، میرٹھ کے نام سے مشہور ہے۔شیفتہ کے مکان سے ملحق دیوان خانہ تھا ۔اسی دیوان خانے میں مرزا غالب کو قیام میرٹھ کے دوران ٹھہرایا گیا۔مرزا غالب نے مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام چاشتگاہ شنبہ 21 جنوری 1860 کو ایک خط اور لکھا جس میں انھوں نے اس بات کو واضح کیا کہ وہ رام پور جاتے ہوئے میرٹھ میں

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکان پر رُ کے تھے۔دراصل مرزا غالبؔ نے اس خط میں رام پور کے سفر کی روداد کو بیان کیا ہے۔خط ملاحظ کیجیے:

''بھائی!

میں نے دلّی کو چھوڑا اور رام پور کو چلا۔پنجشنبہ انیس کو مراد نگر اور جمعے بیس کو میرٹھ پہنچا۔آج شنبہ اکیس کو بھائی مصطفیٰ خاں کے کہنے سے مقام کیا۔یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر بھیجا۔کل شاہ جہاں پور، پرسوں گڑھ مکتیشر ہوں گا۔پھر مراد آباد ہوتا ہوا رام پور جاؤں گا۔اب جو مجھ کو خط بھیجو، رام پور بھیجنا۔سرنامے پر رام پور کا نام اور میرا نام کافی ہے۔اب اسی قدر لکھنا کافی تھا۔باقی جو کچھ لکھنا ہے وہ رام پور سے لکھوں گا۔''6

اس طرح مرزا غالبؔ نے میرٹھ میں پہلی مرتبہ 22 جنوری 1859 سے 25 جنوری 1859 تک قیام کیا۔دوسری مرتبہ رام پور جاتے ہوئے ایک روز کے لیے 21 جنوری 1860 کو قیام کیا۔تیسری مرتبہ رام پور سے واپس آتے ہوئے 24 مارچ 1860 کو میرٹھ میں قیام کیا۔مرزا غالب نے 2 فروری 1859 بروز بدھ کو ایک طویل خط میر مہدی مجروح کے نام تحریر کیا۔جس میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی جاگیر کو انقلاب 1857 کے ہنگامے میں انگریزوں کے ذریعے ضبط کر لینے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ساتھ ہی مرزا غالبؔ نے اپنے قیامِ میرٹھ کے ایام اور نواب شیفتہ کے یہاں ٹھہرنے کی تفصیل بھی تحریر کی۔مرزا غالبؔ لکھتے ہیں:

''سید صاحب!

نہ تم مجرم نہ میں گنہگار۔تم مجبور میں ناچار۔لو اب کہانی سنو۔میری سرگذشت میری زبانی سنو۔نواب مصطفےٰ

خاں بہ میعادسات برس قید ہو گئے تھے، سو اُن کی تقصیر
معاف ہوئی اور اُن کو رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہاں گیر
آباد کی زمین داری اور دلّی کی املاک اور پینشن کے
باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ
ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے
ہیں۔ میں بہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر
میرٹھ گیا۔ اُن کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک
میں اپنے گھر آیا۔ دن و تاریخ آنے جانے کی یاد
نہیں، مگر ہفتے کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری
ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ انتظار میں تھا
کہ تمہارا خط آئے تو اُس کا جواب لکھا جائے۔ آج
صبح کو تمھارا خط آیا، دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں:

روز اِس شہر میں ایک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ
حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں
ہے۔'' 7

مرزا غالب نے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام یک شنبہ 20 جنوری 1861 کو ایک خط لکھا۔ اس خط میں مرزا ہرگوپال تفتہ کو ''مراۃ الصحائف'' کے تماشے اور ''سنبلستان'' کی اشاعت پر پیشگی مبارک باد دی۔ ساتھ ہی میرٹھ میں مرزا ہرگوپال تفتہ کے موجود ہونے اور یہاں پر مصطفےٰ خاں بہادر سے ملاقات ہونے پر مرزا غالب کا سلام پہنچانے کی بات کہی گئی۔ خط ملاحظہ کیجیے:

''صاحب!

تمھارا خط میرٹھ سے آیا۔''مرآۃ الصحائف'' کا تماشا
دیکھا۔''سنبلستان'' کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے،اور
خدا ہی تمہاری آبرو کا نگہبان رہے....جناب بھائی
صاحب یعنی مصطفےٰ خاں بہادر سے ملاقات ہو تو میرا
سلام کہہ دینا۔'' 8

مرزا غالب کے قیام میرٹھ کے سلسلے میں سید مقبول عالم نے ایک صغیر بلگرامی کے نام تحریر کیا ہے۔اس خط کے مطالعے سے غالب اور میرٹھ کے سلسلے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہے۔خط ملاحظہ کیجیے:

''شوال اک آدھا مہینہ گزرا تھا کہ راقم الحروف اپنے
بھائی سید آل محمد صاحب اور سید برکات حسن صاحب
کے ہم راہ میرٹھ کے سفر کے لیے مارہرہ سے روانہ
ہوا۔اس سفر کا مقصد جناب غالب کی خدمت میں
حاضری کا اشتیاق تھا۔ہم تینوں بھائیوں کے علاوہ
عزیزی مظہر علی نبیرۂ بالا میاں صاحب مرحوم بھی جو اپنا
روزگار ترک کر کے مرزا صاحب کا اشتیاق رکھتے تھے
ہمراہ ہو گئے۔'' (فارسی سے اُردو ترجمہ) 9

محمد مشتاق شارقؔ میرٹھی نے اپنی کتاب ''میرٹھ کی ادبی خدمات'' میں مرزا غالبؔ کے دبستانِ میرٹھ سے ادبی تعلقات پر تفصیلی مواد فراہم کیا ہے۔محمد مشتاق شارقؔ نے مکاتیب غالب کی اولین اشاعت اور حاجی ممتاز علی خاں کی کاوشوں کو منظر عام پر لاتے ہوئے لکھا کہ ''رقعاتِ غالبؔ کا پہلا مجموعہ 'عود ہندی' 27 اکتوبر 1868 کو مرزا کی وفات سے چار ماہ قبل مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوا۔اس میں ممتاز علی کا پیش

لفظ ،سرؔور کا دیباچہ اور قلقؔ اور انؔ کے شاگردوں کے قطعات تاریخ شامل ہیں۔''اس بارے میں محمد مشتاق شارقؔ نے مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا:

''رقعات کے ساتھ منشی ممتاز علی نے غالبؔ کے
کلیات کی اشاعت کی تحریک بھی شروع کر دی تھی
جسے چھاپنے کے لیے منشی عظیم الدین کتب فروش تیار
تھے،مگر بعض مصالح کی بنا پر غالب نے میرٹھ میں
دیوان کے انطباع کو پسند نہ کیا،بعد میں یہ دیوان
29جولائی 1861 کو مطبع احمدی واقع
شاہدرہ (دہلی) امیں مطبوع ہوا۔''10؎

محمد مشتاق شارقؔ نے مرزا غالبؔ کے میرٹھ میں قیام اور رقعات غالبؔ کی طباعت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مزید تحریر کیا:

''غالبؔ کی میزبانی کا شرف شیفتہ کو حاصل تھا،حاجی
ممتاز علی کمبوہ اپنے چھتّے واقع خیر نگر میرٹھ میں رہتے
تھے،غدر کے بعد جب شیفتہ میرٹھ منتقل ہوئے تو
حاجی ممتاز علی نے جو شیفتہ کے عزیز بھی تھے ،اپنا
مکان ان کے قیام کے لیے دے دیا،شیفتہ جس
مکان میں ٹھہرائے گئے اس میں اب حمیدیہ گرلز جونیر
ہائی اسکول قائم ہے،اس سے ملی ہوئی ان کی بیٹھک
تھی جو غالبؔ کو ٹھہرانے کے لیے دی گئی، یہاں اس کا
اظہار ضروری ہے کہ منشی ممتاز اور حاجی ممتاز علی دو
علاحدہ علاحدہ شخصیتیں ہیں ،منشی ممتاز علی مطبع مجتبائی
کے مالک تھے اور حاجی ممتاز علی رئیس میرٹھ و

> اٹاوہ،عود ہندی کی اشاعت کی تحریک حاجی ممتاز علی کی طرف سے ہوئی۔حاجی ممتاز علی کو شعروادب سے کم دل چسپی تھی وہ سرکاری عمارتوں کی ٹھیکے داری کا کام کرتے رہتے مگر غالبؔ کے پرستاروں میں سے تھے،اسی باعث غالبؔ کے خطوط کی اشاعت کی ذمہ داری انھوں نے قبول کی اور عود ہندی کی دوسری فصل کی ترتیب میں حصہ لیا،چوں کہ ان کے تعلقات وسیع تھے اس لیے ان کی تحریک سے غالبؔ کے خطوط مختلف جگہوں سے فراہم ہوئے۔'' 11؎

منشی ممتاز علی خاں مرزا غالبؔ کے اُردو دیوان کو میرٹھ سے شائع کرنا چاہتے تھے۔اس کام میں منشی ممتاز علی نے عظیم الدین کتب فروش میرٹھی کو مرزا غالبؔ کے اُردو دیوان کی طبع و اشاعت کے لیے تیار کیا تھا۔لیکن میرٹھ کی قسمت میں اس دیوان کی اشاعت نہ تھی۔مرزا غالبؔ کے اس سے قبل اُردو دیوان کے دو اڈیشن 1841 اور 1847 میں شائع ہو چکے تھے۔مرزا غالبؔ نے منشی شیو نارائن آرام کے نام اپریل 1860 میں اس بابت ایک تفصیلی خط تحریر کیا۔جس میں منشی ممتاز علی خاں کی اُردو دیوان کی اشاعت سے متعلق بہت سی باتوں پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔مرزا غالبؔ کی خواہش تھی کہ ان کا اُردو دیوان دہلی کی کسی مشہور پریس سے چھاپا جائے۔لیکن منشی ممتاز علی خاں کے استفسار کو وہ ٹال نہ سکے اور اپنا اُردو دیوان رام پور میں قیام کے دوران کاتب سے لکھوا کر میرٹھ بھجوایا۔ جہاں پر اس دیوان کی تصحیح کا ذمہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے مرزا غالبؔ کے اسرار پر قبول کیا۔ان مذکورہ بالا تمام امور پر تفصیل سے مرزا غالبؔ

نے لکھا:

''میاں!

دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سُن لو تب کچھ کلام کرو میں رام پور میں تھا کہ ایک خط پہنچا سر نامے پر لکھا تھا؛''عرض داشت عظیم الدین احمد، من مقام میرٹھ۔'' واللہ باللہ، اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہ ہر حال پڑھا۔ معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اُٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر، چپ رہا۔ جب میں رام پور سے میرٹھ آیا ، بھائی مصطفےٰ خاں صاحب کے ہاں اُترا۔ وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوستِ قدیم مجھ کو ملے ،انھوں نے کہا کہ اپنا اُردو کا دیوان مجھ کو بھیج دیجیے گا۔ عظیم الدین ایک کتاب فروش اُس کو چھاپا چاہتا ہے۔ اب تُم سنو، دیوان ریختہ مکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں میں غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رام پور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلّی سے رام پور جانے لگا ،تو بھائی ضیاء الدین صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوانِ اُردو لے کر اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رام پور میں کاتب سے لکھوا کر بہ سبیلِ ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلّی بھیج دیا تھا۔

آمدم بر سرِ مدعا سابق۔اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا، دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیج دوں گا، مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے؟ نواب مصطفےٰ خاں نے کہا کہ ''میں ''۔اب کہو میں کیا کرتا؟ دلّی آ کر ضیاء الدین خاں سے دیوان لے کر، ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفےٰ خاں کے پاس بھیج دیا۔اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر پرائے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بجھواتا؟ آج اس وقت میں نے تم کو یہ خط لکھا اور اسی وقت بھائی مصطفےٰ خاں صاحب کو ایک خط بھیجا ہے اور اُن کو لکھا ہے:''اگر چھاپا شروع نہ ہوا ہو، تو نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے؛ اگر دیوان آ گیا تو فوراً تمھارے پاس بھیج دوں گا۔اور اگر وہاں کاپی شروع ہوگئی ہے تو میں ناچار ہوں، میرا کچھ قصور نہیں ہے۔اور اگر سرگذشت کو بھی سن کر مجھ کو گناہگار ٹھہراؤ، تو اچھا، میرا بھائی، میری تقصیر معاف کیجیو۔رمضان اور عید کا قصہ لگا ہوا ہے۔یقین ہے کہ کاپی شروع نہ ہوئی ہو اور دیوان میرا میرے پاس آئے اور تم کو پہنچ جائے۔''[12]

مرزا غالبؔ کا یہ دیوان 29 جولائی 1861 میں شائع ہوا۔لیکن منشی شیو نارائن آرام مرزا غالبؔ کے اُردو دیوان کو خود شائع کرنا چاہتے تھے۔مرزا غالبؔ بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کا دیوان منشی شیو نارائن آرام ہی چھاپیں۔لیکن اپریل 1860 سے لے کر 10 جنوری 1862 یعنی کم و بیش ایک سال نو مہینے میں بھی منشی شیو نارائن آرام

مرزا غالبؔ کی دیرینہ خواہش کی تکمیل نہ کر سکے۔ مرزا غالبؔ نے اپنا اُردو دیوان میرٹھ سے واپس صرف اس لیے منگوایا تھا کہ اسے منشی شیو نارائن آرام بہتر طریقے یعنی عمدہ طباعت کے ساتھ شائع کریں۔ دراصل مرزا غالبؔ نے اپنے دیوان کو میرٹھ میں سکندر شاہ کے ہاتھ مارچ 1860 کے اخیر میں بھیجا تھا۔اس کی رسید مرزا غالبؔ کو بعد میں ڈاک سے موصول ہوئی۔اس بارے میں مرزا غالبؔ نے 17 شوال 1276ھ مطابق 9 مئی 1860 کو یوسف مرزا کے نام تحریر کیے گئے خط کی اندرونی سطور میں لکھا کہ ''میرا اُردو کا دیوان میرٹھ کو گیا۔سکندر شاہ لے گئے۔ مصطفیٰ خاں کو دے آئے۔ڈاک میں اُس کی رسید آ گئی۔ نہ ''بُرہانِ قاطع'' نہ قاطعِ بُرہان۔'' (غالب کے خطوط، جلد دوم، صفحہ 783)۔ مرزا غالب نے اپنے اُردو دیوان کو میرٹھ سے واپس منگوانے کے لیے ہر ممکن جتن کیا۔اس کے لیے انھوں نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کے نام خطوط ارسال کیے کہ کسی بھی طرح ان کا اُردو دیوان میرٹھ سے واپس آ جائے۔میاں داد خاں سیاحؔ کے نام دو شنبہ 11 جون 1860 کو لکھے گئے خط میں مرزا غالب نے عظیم الدین کتب فروش میرٹھی کو بھوت، پلید، غول اور نا معقول القاب و آداب سے نوازا۔اس خط میں میرٹھ سے دیوان واپس منگوانے کی تفصیل مرزا غالبؔ نے کچھ اس طرح لکھی ہے:

> ''دیوان کا چھاپا کیسا؟ وہ شخص نا آشنا، موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا، آدمی نہیں ہے، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے، قصہ مختصر، سخت نا معقول ہے۔ مجھ کو اُس کے طور پر انطباعِ دیوان نا مطبوع ہے۔اب میں اُس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔خدا کرے ہاتھ آ جائے، تم دعا مانگو۔زیادہ کیا لکھوں؟'' 13

خداوند کریم نے رمضان المبارک کے مہینے میں مرزا غالب کی اس دعا کو قبول کیا اور محض کچھ دن بعد ہی مرزا غالبؔ کا اُردو دیوان ان کے پاس میرٹھ سے واپس دہلی آ گیا۔ مرزا غالبؔ نے عید کے دن یعنی شنبہ روز عید مطابق 30 جون 1860 کو یہ خوش خبری میاں داد خاں سیاحؔ کو یوں سنائی:

''میں بہت خوشی سے تم کو یہ اطلاع دیتا ہوں کہ اُردو کا دیوان غاصبِ نا انصاف سے ہاتھ آ گیا اور میں نے نور چشم منشی شیو نارائن کو بھیج دیا۔ یقین کلّی ہے کہ وہ چھاپیں گے۔ جہاں تم ہو گے ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔'' 14

مرزا غالبؔ نے اپنے اُردو دیوان کی اشاعت میں ہو رہی تاخیر کے سلسلے کے ساتھ اپنی ناراضگی اور خفگی کا بر ملا اظہار منشی شیو نارائن آرام کے نام 10 جنوری 1862 کو لکھے خط میں کیا۔ جس میں اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ مرزا غالبؔ نے منشی ممتاز علی خاں سے اپنا اُردو دیوان اس لیے واپس لے لیا تھا کہ منشی شیو نارائن آرام کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ ان کے رہتے مرزا غالبؔ کا اُردو دیوان میرٹھ سے شائع ہو۔ منشی شیو نارائن کی ناراضگی کو دور کرتے ہوئے مرزا غالب اس خط میں رقم طراز ہیں:

''میاں!

میں جانتا ہوں کہ مولوی میر نیاز علی صاحب نے وکالت اچھی نہیں کی۔ میرا مدعا یہ تھا کہ وہ تم پر اس امر کو ظاہر کریں کہ دلّی میں ہندی دیوان کا چھپنا پہلے اُس سے شروع ہوا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب تمھارا بھیجا ہوا فرما مجھ کو دیں اور وہ جو میں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی، یہ سمجھ کر دی تھی کہ اب تمھارا ارادہ اس

کو چھاپنے کا نہیں۔ غور کرو، میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم نے کس عجز و الحاج سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تمہاری ناخوشی پر یہ جبر اس سے پھیر لیا۔ یہ کیوں کر ہوسکتا تھا کہ اور کو چھاپنے کی اجازت دوں؟ تم نے خط لکھنا موقوف کیا، میں سمجھتا ہوں کہ تم خفا ہو۔ میں نے مولوی نیاز علی صاحب سے کہا کہ بر خوردار شیو نارائن سے میری تقصیر معاف کروا دینا۔

بھائی، خداوند کی قسم میں تم کو اپنا فرزند دلبند سمجھتا ہوں۔ اس دیوان اور تصویر کا ذکر کیا ضرور ہے؟ رام پور سے وہ دیوان صرف تمہارے واسطے لکھوا کر لایا۔ دلّی میں تصویر بہ ہزار جستجو بہم پہنچا کر مول لی اور دونوں چیزیں تم کو بھیج دیں۔ وہ تمھارا مال ہے، چاہو اپنے پاس رکھو، چاہے کسی کو دے ڈالو۔ چاہو پھاڑ کر پھینک دو۔'' 15

لیکن منشی شیو نارائن کی قسمت میں مرزا غالبؔ کے اُردو دیوان کی اشاعت کا حق نہیں تھا۔ غالبؔ کے اُردو دیوان کو دہلی کے مطبع احمدی (شاہ درا) نے 29 جولائی 1861 کو شائع کیا۔ مرزا غالبؔ کے ''دیوانِ ریختہ'' جو 1272 ھ میں شائع ہوا تھا اس پر حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی نے اپنے شاعرانہ کمالات کا مظاہرہ کرتے ہوئے عقیدت سے لبریز ایک قطعۂ تاریخ ''قطعۂ تاریخ دیوانِ ریختہ اوستادی غالب سلمہ اللہ تعالیٰ'' لکھا۔ اس قطعے میں رنجؔ میرٹھی نے اپنے اُستاد کے دیوان کی اشاعت پر مسرت کا اظہار کیا ہے۔ قارئین کی خدمت میں، میں رنج میرٹھی کا تاریخی قطعہ پیش کر رہا ہوں:

''قطعۂ تاریخ دیوانِ ریختہ اوستادی غالب سلمہ اللہ تعالیٰ''

اسد اللہ خاں غالبؔ کا
ریختہ کا وہ نسخۂ دل خواہ
پھر بہ صحت چھپا بطرز جدید
ہو نظارے سے جس کے تیز نگاہ
کیا سخن پاک ہے کہ کرتی ہے
بہر اشعار شست و سوئے گناہ
مست کہتے ہیں یوں مزا چکھ چکھ
کیا شراب دو آتشہ ہے واہ

۱۲۷۷ہجری16ء

انقلاب 1857 کے ہنگامے کے دوران مرزا غالبؔ نے اپنی زندگی کے ایام کو کتابوں کے مطالعے میں گزارا۔ اس دوران مرزا غالبؔ نے اپنے ادبی مشغلے کو عروج بخشا۔ غدر کے ایام میں مرزا غالبؔ نے ''دستنبو'' (حالاتِ غدر کا روز نامچہ) لکھنے کے علاوہ محمد حسین برہان تبریزی کی مشہور فارسی لغت ''برہان قاطع'' کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا۔ مرزا غالبؔ کو اس لغت میں جہاں بھی کوئی فروگزاشت نظر آتی، یا جن الفاظ و معنی سے انھیں اختلاف یا اعتراض تھا، انھیں لغت کے حاشیے پر لکھ لیتے۔ جب 1857 کا غدر کمزور پڑا تو مرزا غالبؔ لغت پر لکھے حاشیوں کی مدد سے ''قاطع برہان'' نامی رسالہ بقول مرزا غالبؔ ''تیسری چوتھی نظر کے بعد کاتب سے صاف کرائی گئی تھی'' کا پہلا اڈیشن مطبع نول کشور لکھنؤ سے 1862 میں شائع ہوا۔ دراصل مرزا غالبؔ نے اس لغت پر تین سال یعنی 1857 سے 1860 تک کام کیا تھا۔ قاطع برہان کی اشاعت کے بعد علمی و ادبی حلقوں میں ہنگامہ برپا ہوا۔ ہنگامۂ کلکتہ کے بعد مرزا غالبؔ کی زندگی میں یہ دوسرا ادبی ہنگامہ تھا جس نے تا عمر غالبؔ کی زندگی کو متاثر کیا۔ قاطع

برہان پر ملک کے مختلف مقاماتِ سے اعتراضات کتابی شکل میں شائع ہونے لگے۔ یہاں تک کہ جب مرزا غالبؔ نے اس کتاب کو اپنے خط کے ساتھ ٹی۔ ایچ ٹھارنٹن معتمد برائے حکومت پنجاب کو سرکاری کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ کے نصاب میں شامل کرنے کے واسطے بھجوایا تو اس وقت کے ماہرین تعلیم بالخصوص کریم الدین ڈپٹی انسپکٹر مدارس اور علمدار حسین پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور نے مرزا غالبؔ کی اس تالیف کو نہ صرف مسترد کیا بلکہ انگریز حکومت کو یہ مشورہ بھی دیا کہ ''مولف نے قاطع برہان پر جو اعتراضات لگائے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں''۔ اس ادبی اور علمی ہنگامے کے بعد مرزا غالبؔ نے اس کا دوسرا اڈیشن ''درفش کاویانی'' کے نام سے شائع کیا۔ قاطع برہان کے علمی و ادبی جھگڑے پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی آرا کو پیش کرتے ہوئے تحریر کیا:

''غالب کی ''قاطع برہان'' پر جو اُدھم علمی حلقوں میں مچا اس کا ایک سبب یہ تھا کہ ''برہان قاطع'' ایک مستند لغت کے طور پر گذشتہ دو سو سال سے ہندوستانِ و ایران میں استعمال ہو رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ غالبؔ نے استہزا کے ساتھ جو اعتراض برہان قاطع اور اس کے مصنف محمد حسین برہان تبریزی پر کیے تھے، ان کا اندازِ بیان نامناسب تھا۔ تیسرے یہ کہ غالب نے زیادہ تر اپنی ہی رائے پر تکیہ کیا تھا۔ قدیم لغات ان کے سامنے نہیں تھے اور انھوں نے قیاساً لکھ دیا تھا کہ ''برہان'' کے لغات کسی اور کتاب میں نہیں ملتے جس کا جواب ''برہان قاطع'' کے حامیوں نے دیا اور اس قیاس کو بے بنیاد بتا کر غلط ثابت کیا۔ دراصل لغت

نویسی غالب کا کام نہیں تھا۔'' 17

مرزا غالب کی قاطع برہان کے جواب میں ہندوستان میں جو کتابیں یا رسالے منظر عام پر آئے ان کی فہرست درج ذیل ہے:

(ا) محرق قاطع برہان (فارسی) از سید سعادت علی، مطبوعہ احمدی، شاہدرہ، 1280ھ/ 1864

(2) ساطع برہان (فارسی) از رحیم بیگ رحیم میرٹھی، مطبع ہاشمی، میرٹھ 1283ھ

(3) قاطع القاطع (فارسی) از امین الدین دہلوی، مطبع مصطفائی دہلی 1283ھ

(4) مؤید برہان (فارسی) از آغا احمد علی احمد، مطبع مظہر العجائب کلکتہ 1282ھ

(5) ہنگامۂ دل آشوب (فارسی) مطبوعہ آرہ 5 ذالحجہ 1283ھ

(6) تیغ تیز (فارسی) مطبوعہ مطبع نبوی، کلکتہ 1284ھ

(7) ہنگامۂ دل آشوب (حصہ دوم) مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ 1867

(8) شمشیر تیز تر از آغا احمد، مطبع نبوی، کلکتہ 1868

مذکورہ بالا فہرست کے مطابق ''قاطع برہان'' کے منظر عام پر آنے کے بعد میرٹھ کے مرزا رحیم بیگ میرٹھی نے ''ساطع برہان'' (فارسی) کے نام سے 108 صفحات پر مشتمل ایک کتاب 1283ھ مطابق 1865 میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع کی جس میں مرزا غالبؔ کے اعتراضات کا مدلل اور معقول جواب تلخ اور طنز آمیز انداز میں دیا گیا۔ مرزا غالبؔ نے ساطع برہان کا مطالعہ کرنے کے بعد عبدالرزاق شاکرؔ اور میاں داد خاں سیاحؔ کے نام خطوط ارسال کیے۔ ان خطوط میں مرزا رحیم بیگ کو مرزا غالبؔ نے زہرناکی اور تلخی کے ساتھ تضحیک و تحقیر کا نشانہ بنایا۔ مرزا غالب نے میاں داد خاں سیاحؔ کے نام دوشنبہ 11 ستمبر 1865 کو اس بابت خط تحریر کیا۔ لکھا:

''وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملاے مکتب دار کا خبط ہے، رحیم بیگ اُ

س کا نام، میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا
ہے۔ با وجود نا بینائی کے احمق بھی ہے۔ اُس کی تحریر
میں نے دیکھی، تم کو بھی بھیجوں گا۔ مگر ایک بڑے
مزے کی بات ہے کہ اُس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن
کو ''لطائفِ غیبی'' میں رد کر چکے ہو، بہر حال اُس کے
جواب کی فکر نہ کرنا۔ والسلام والاکرام۔''18؎

مرزا غالب نے مولوی محمد عبدالرزاق شاکرؔ کے نام اکتوبر، دسمبر 1865 میں ایک خط تحریر کیا۔ اس خط میں میں مرزا غالبؔ نے مرزا رحیم بیگ کی علمی وادبی صلاحیتوں کے بارے میں طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے سوالیہ نشان قائم کیے۔ یہاں تک کہ مرزا رحیم بیگ کے استاد امام بخش صہبائی کی عالمانہ صلاحیتوں پر بھی انگشت زنی کی۔ یہاں تک کہ مرزا غالبؔ نے مرزا رحیم بیگ کو امام بخش صہبائی کا شاگرد ماننے سے بھی انکار کیا۔ اس خط کو تحریر کرنے سے قبل مرزا غالبؔ، مرزا رحیم بیگ میرٹھی کے نام بھی ایک خط تحریر کر چکے تھے، جو ادبی دنیا میں ''نامۂ غالبؔ'' کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ مولوی شاکرؔ کو مرزا غالبؔ نے ساطع برہان کے تعلق سے لکھا:

''نامۂ غالبؔ کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا
رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا
ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے، عبارت لکھ
نہیں سکتا لکھوا دیتا ہے، بلکہ اُس کے ہم وطن ایسا کہتے
ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا
ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی
سے اُس کو تلمیذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو
اُن کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اُس ہیچ

پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزّ و وقار ہو۔ رسالہ
اُس کا ''ساطع برہان'' دلّی پہنچ کر ڈھونڈوں گا، اگر مل گیا
تو خدمت میں پہنچے گا۔''19؎

مرزا غالبؔ اور مرزا رحیم بیگ میرٹھی کے اس ادبی معرکے پر محمد مشتاق شارقؔ نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

''جہاں تک نامۂ غالبؔ؛ کے انداز نگارش کا تعلق ہے بقول مرزا محمد عسکری ''اس میں وہ چٹکیاں لی ہیں کہ اول سے آخر تک پورا خط خار زار معلوم ہوتا ہے۔'' (بحوالہ ادبی خطوط غالب) صرف القاب ہی سے اندازہ لگائیے کہ اسے پڑھ کر رحیم بیگ پر کیا گزری ہوگی، غالب لکھتے ہیں کہ ''بخدمت مشفقی مکرم مرزا رحیم بیگ صاحب نور الہ، قبلہ، بالا سرار عینہ بالانوار'' بہر حال مقصود اس تمام بحث سے یہ ہے کہ خاک میرٹھ نے ایک ایسی ہستی کو بھی جنم دیا جس نے غالبؔ کو نہ صرف عقیدت کی نظر سے دیکھا بلکہ غالبؔ کے محاسن و معائب کو نقد کی کسوٹی پر پرکھا بھی۔''20؎

مرزا غالبؔ کا یہ نامۂ غالب سب سے پہلے دہلی میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں لکھنؤ کے اودھ اخبار میں 10 و 12 اکتوبر 1865 کی اشاعتوں میں اسے شامل کیا گیا۔ اس کے بعد منشی ممتاز علی خاں میرٹھی نے اسے عود ہندی میں شامل کیا۔ غالب کے خطوط، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم نے اسے جلد چہارم میں صفحہ 1474 تا 1488 شامل کیا ہے۔ اس خط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا رحیم بیگ کے لیے مرزا غالبؔ نے طرح طرح کے توہین آمیز الفاظ استعمال کیے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس خط کے اہم

نکات کو اگر یہاں پیش نہ کیا گیا تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ مرزا رحیم بیگ کو لکھے گئے خط کی روشنی میں مرزا غالبؔ کی فارسی دانی اور لغات کے سلسلے میں ان کے خیالات اور ذاتی تجربات پر بھی بحث کے نئے نکات نکلتے ہیں۔ ویسے مرزا غالبؔ نے اس خط میں ایک جگہ اپنی غلطی کو تسلیم کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ''آدیزہ وافسوس کے بیان میں مجھ سے سہو ہوا ہے، مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد شرمسار ہے۔'' جب مرزا غالبؔ نے اپنی غلطی کو تحریری طور پر تسلیم کر لیا تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مرزا رحیم بیگ میرٹھی کے قاطع برہان پر کیے گئے اعتراضات صحیح تھے۔ اب میں نامۂ غالب سے چند اقتباسات (مشمولہ غالبؔ کے خطوط جلد چہارم، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم، اشاعت 2011) پیش کرنے کی سعی کر رہا ہوں، جس میں مرزا رحیم بیگ کی شخصیت اور علمیت کو مجروح کیا گیا ہے:

''احسان مند ہوں آپ کا کہ آپ نے منشی سعادت علی کی طرح آدھا نام میرا نہ لکھا۔ اُن کے حسن ظن کے مطابق مجھ کو معشوق میرے اُستاد کا نہ لکھا۔ اگر ایک جگہ یہ الفاظ کہ بقول غالبؔ با کدام خرس در جُوال شدہ ام'' بہم کیے، یا اور دو چار جگہ کلمۂ توہین رقم کیے، میں نے اپنے لطفِ طبع اور حسنِ عقیدت سے پہلے فقرے کا مفہوم یوں اپنے دل نشیں کیا کہ حضرت نے محمد حسین دکنی، جامع برہان کو موافق میرے قول کے خرس یقین کیا۔'' (صفحہ 1474)

''جناب مرزا صاحب! کیا تم نہیں جانتے، کیوں کر نہیں جانتے، بے شبہہ جانتے ہو گے کہ اکابرِ اُمّت کو اُمورِ دینی میں کیا کیا مُنازعتیں باہم واقع ہوئی ہیں

کہ نوبت بہ تکفیر یک دِگر پہنچی ہے۔'' (صفحہ 1475)

''زبان دانی فارسی میری ازلی دستگاہ،اور یہ عطیۂ خاص مِن جانب اللہ ہے۔فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے، مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے۔ ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گوار معنی یاب ہیں،لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعویِ زبان دانی کے باب ہیں۔'' (صفحہ 1477)

''ایک لطیفہ لکھتا ہوں،اگر خفانہ ہو جاؤ گے تو حظ اٹھاؤ گے جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں ، یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانندِ پیاز ہیں تو بہ تو اور لباس در لباس ،وہم در وہم اور قیاس در قیاس ، پیاز کے چھلکے جس قدر اُتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا ،مغز نہ پاؤ گے۔فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے چلے جاؤ ،لباس ہی لباس دیکھو گے شخص معدوم۔فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو،ورق ہی نظر آئیں گے ۔معنی موہوم۔'' (صفحہ 1477)

''سچ ہے غالبؔ آگندہ گوش ہے،کسی کی نہیں سنتا۔اسی آپ کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کے موافق بہ حلف کہتا ہوں کہ تم نے ''قاطع برہان'' و ''دافعِ ہذیان'' و ''لطائفِ غیبی'' کو ہرگز نہیں دیکھا۔''آویزہ افسوس'' کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اُس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد خاں شرمسار ہے، جو کچھ اُس مصنف نے اس

باب میں لکھا وہ قولِ فیصل اور کافی ہے، مانیں یا نہ مانیں، ناظرین کو اختیار ہے۔'' (صفحہ 1478)

''یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو امام محققین خطاب دیا ہے ، کتنے محققین نے ان کو اپنا امام مان لیا ہے؟ جب تک نہ اجماع محققین کا ہوگا، یہ خطاب با اجماعِ اہلِ عقل نا جائز و نا روا ہوگا۔'' (صفحہ 1481)

''مجھے تم پر ہنسی آتی ہے۔ بعض بات سمجھی نہیں جاتی ہے۔ خاقانی روح کو آبدست دِہ مجاورانِ حرم'' کہتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ خاقانی ''دستآب دِہ'' اسم پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہتا ہے۔ مولوی امام بخش نے تم کو بہت کچھ پڑھایا مگر طریقۂ استنباطِ معنی نہ بتایا۔ میرے حق میں جو کہتے ہو ، خود بھی نہیں سمجھتے کہ کیا کہتے ہو۔'' (صفحہ 1486)

''میں اب قطعِ کلام کرتا ہوں، اور آپ کو بکمالِ تعظیم سلام کرتا ہوں پیمبری کی تحقیر کو مسلم رکھتے ہو، تم جانو اور سید ابرار، خاقانی پر بہتان کرتے ہو، تم جانو، اور وہ میدانِ معنی کا شہسوار۔ مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور لکھ رہا ہے اگر چہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے، معقول اور راست نہیں، لیکن واللہ ، مجھ کو عرصۂ محشر میں اُس کی باز خواست نہیں:

زیمنِ عشق بکَو نین صُلح کُل کر دیم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

(صفحہ 1488)21

مرزا غالبؔ نے سید احمد فرقانیؔ وساکیؔ و باکیؔ میرٹھی(1883-1836) سے بھی برہان قاطع کے لفظ ''آوازگشتن'' کے سلسلے میں خط و کتابت کی تھی۔فرقانیؔ میرٹھی 1862 سے 1868 تک دہلی میں مقیم رہے۔اسی درمیان فرقانیؔ میرٹھی کے ادبی مراسم مرزا غالبؔ سے ہوئے۔فرقانیؔ میرٹھی کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔اس زمانے میں غالبؔ شعر گوئی سے توبہ کر چکے تھے۔لیکن ادبی ذوق وشوق ہنوز برقرار تھا۔لیکن فرقانیؔ میرٹھی کے قصیدے

شد وقت کہ در طرّۂ سنبل شکن افتد

با غرّہ گل لالہ چو در مقترن افتد

کو سن کر مرزا غالبؔ نے فرقانیؔ میرٹھی کی پیشانی کو کھڑے ہو کر چوما اور شرکائے مجلس سے مخاطب ہو کر کہا:

''غالب زندہ سید احمد حسین ہیں اسد اللہ غالبؔ مردہ۔سب لوگوں کو ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں اور اثنائے داد میں یہ بھی فرمایا کہ گل کے ساتھ غرّہ لفظ کم از کم تین دن کی تلاش میں ملا ہوگا۔''22

برہان قاطع کے حوالے سے جو خط مرزا غالبؔ نے فرقانیؔ میرٹھی کو 1866 میں تحریر کیا اس میں فارسی الفاظ کے وزن پر مباحثہ ہے۔دراصل یہ خط مرزا غالب نے مرزا رحیم بیگ کی کتاب ساطع برہان میں لفظوں پر کی گئی گرفت کے تعلق سے تحریر کیا تھا۔مرزا غالبؔ فرقانیؔ میرٹھی کے استفسار کو رفع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''واقعی فخر گرگانی نے لکھا ہے اور اُس کا قول سند مکمل ہے۔لیکن یہ معلوم رہے کہ متقدمین از راہِ تحکم وزبردستی بہت کچھ کہہ گئے ہیں ۔متاخرین نے ترک کر دیا

ہے، جیسے میؔر و مرزاؔ ''لہو'' کو ''لوہو'' اور طرف کے مرادف ''اُور'' بہ وزن ''شور'' لکھتے تھے، متاخرین نے ترک کر دیا۔

بھائی! میں کیا کہوں، یہ بزرگ وار کیا کیا کچھ کہہ گئے ہیں۔ ما قبل شین مصدری مکسور ہوتا ہے ''نازش'' و ''سازش'' اور اس کے نظائر بہت ہیں۔ خاقانؔی کے ہاں ''کاہش'' حاصل بالمصدر ''کاستن'' کا اور ''نگاہش'' ضمیر کے شین کے ساتھ قافیہ کیا ہے۔ نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ، نہ ایک خاقانؔی نے بلکہ بہت اساتذہ نے۔

بھلا، میں تم سے پوچھتا ہوں ''آب کجا''، ''شراب کجا'' کے ساتھ ''تابہ کجا'' کا قافیہ جائز رکھو گے؟ یقین ہے کہ نہ رکھو گے۔ اب ہم نہ حافظ پر اعتراض کریں گے، نہ اس امر خاص میں تتبع کر سکتے ہیں، قصہ مختصر، میں نے مانا ''قاطع القاطع'' نے دو سو فاقوں میں ایک اعتراض رفع کیا۔ آگے کیا کرے گا؟ اور رفعِ اعتراض اس طرح کہ سوائے ایک شخص کے دوسرے کے کلام سے سند نہ ملے۔'' 23؎

میرٹھ میں مرزا غالبؔ کے پرستاروں اور عقیدت مندوں کی خاصی تعداد موجود تھی، ان مداحین کی زبانوں پر ہر آن غالبؔ کے اشعار چڑھے رہتے تھے۔ ان پرستاروں کا اپنا علاحدہ حلقۂ ادب تھا۔ غالبؔ کے اشعار کی اولین شرح کا سہرا بھی سرزمین میرٹھ کے سر بندھا ہے۔ کلامِ غالبؔ کی شرح کو عام اور سادہ لفظوں میں

مولانا احمد حسن شوکتؔ میرٹھی نے پیش کیا۔مولانا شوکتؔ میرٹھی نے کلام غالبؔ کے 700 اشعار کی شرح لکھی۔شارحین کلامِ غالبؔ کی فہرست میں مولانا شوکتؔ میرٹھی کا نام سرفہرست ہے۔سید محمد مرتضٰی بیاںؔ ویزدانیؔ میرٹھی اس بارے میں رقم طراز ہیں:

"دریں ولا ایک مدّت سے ہم دیکھتے ہیں کہ مشکلات کلام غالبؔ کی دھوم مچی ہے اور بیشتر مغرورین اور متحصلین اشعار کے معنی پوچھتے پھرتے ہیں۔خود ہم کو اپنے عزیز وقت صرف کرنے کا اکثر نقصان اُٹھانا پڑتا ہے نیز دیگر اہل دعوٰی کے بتائے ہوئے (یعنی شوکتؔ میرٹھی کے بتائے ہوئے) معانی غیر واقعہ کا تذکرہ بھی ہم تک پہنچا ہے اس لیے ضرورت ہوئی کہ ہم لسان الملک میں تھوڑی سی جگہ بقدر امکان مصلحت شرح غالب کی نذر کیا کریں۔"24ؔ

مولانا شوکتؔ میرٹھی نے کلام غالبؔ کے علاوہ متنبّی،حماسہ،خاقانیؔ،بیدلؔ اور فرخی کے کلام کی بھی شرحیں لکھی ہیں۔شروع میں مولانا شوکتؔ میرٹھی نے کلامِ غالبؔ کے معنی،مطالب اور مفہوم کو اپنے رسالہ"پروانہ"میں شائع کیا۔لیکن اہل علم وذوق کے اسرار پر اسے 1337 ہجری میں اپنے مطبع شوکتؔ المطابع سے کتابی شکل میں پیش کیا۔

سرزمینِ میرٹھ میں مرزا غالبؔ کے خطوط کے پہلے مجموعے"عود ہندی"جو 10 رجب 1285ھ مطابق 27 اکتوبر 1868 کو مرزا غالبؔ کی وفات سے چار ماہ پہلے مطبع مجتبائی میرٹھ سے،منشی ممتاز علی خاں کی کاوشوں سے شائع ہونے کا شرف حاصل ہے۔منشی ممتاز علی خاں سے قبل چودھری عبدالغفور سرورؔ نے غالبؔ کے خطوط کو یکجا کر بقول ڈاکٹر خلیق انجم 1861 یا 1862 میں"مہر غالبؔ"کے نام سے شائع کیا

تھا۔لیکن منشی ممتاز علی خاں نے سرورؔ کے مجموعۂ خطوط میں دیگر لوگوں کے خطوط کو شامل کرتے ہوئے اسے ''عود ہندی''' کے نام سے شائع کیا۔ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے خطوط کے مقدمے میں ''عود ہندی'' کی اشاعت، منشی ممتاز علی خاں کی کاوشوں، اس مجموعے میں شامل خطوط کی تعداد اور خود مرزا غالبؔ کی اس مجموعے کے منظر عام پر آنے کے لیے بے قراری اور استفسار پر تفصیل کے ساتھ ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے لکھا:

''غلام غوث بے خبرؔ، غالبؔ سے اجازت لے کر اُن کے خطوط کا مجموعہ مرتب کر رہے تھے۔غالبؔ نے نہ صرف بہ خوشی اجازت دی بلکہ خود بھی خطوط کی نقلیں فراہم کیں۔بے خبرؔ نے خطوط جمع کرنے کا کام 1861 میں شروع کیا تھا لیکن 1865 تک اس مجموعے کی طباعت کے آثار نظر نہیں آئے تو بے خبرؔ نے اپنا مرتب کیا ہوا مجموعہ منشی ممتاز علی خاں کو بھیج دیا۔منشی صاحب نے ''مہر غالبؔ'' اور اس مجموعے کو ملا کر اس کا نام عودِ ہندی رکھا اور خود بھی اس مجموعے پر دیباچہ لکھا۔مجموعے میں دو فصلیں ہیں۔پہلی فصل کی ابتدا چودھری عبدالغفور سرورؔ کے دیباچے سے ہوتی ہے۔اور پھر وہ 31 خط ہیں جو سرورؔ نے مرتب کیے تھے۔دوسری فصل میں حسب ذیل حضرات کے نام خطوط ہیں: صاحب عالم مارہروی (2 خط) انور الدولہ شفق (20 خط) مرزا یوسف علی خاں عزیز (2 خط) مرزا ہرگوپال تفتہؔ (1 خط) مرزا حاتم

علی مہؔر (18 خط) غلام غوث خاں بے خبؔر (25 خط)
عبدالغفور نساخؔ (1 خط) ظہیر الدین خاں کی طرف
سے اُن کے چچا کے نام (1 خط) نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ
کے نام (1 خط) مردان علی خاں رعنا (2 خط) مرزا رحیم
بیگ (1 خط) عبدالرزاق شاکر (10 خط) قاضی
عبدالجمیل جنونی بریلوی (17 خط) مولوی عزیز
الدین (1 خط) سید محمد عباؔس (1 خط) منشی غلام بسم
اللہ (1 خط) مجروح (13 خط)
میہر سرفراز حسین (1 خط)۔''25

غالبؔ کے خطوط کے اس مجموعے میں ممتاز علی خاں کے دیباچہ کے علاوہ آخر میں حکیم مولا بخش قلق میرٹھی کی تقریظ شامل ہے۔ قلق میرٹھی نے اس تقریظ کی ابتدا رباعی لکھ کر کی۔ پوری تقریظ میں 2 رباعی، 2 مثنوی اور 2 شعر شامل ہیں۔ قلق میرٹھی کی آسان اور سلیس نثر نگاری کے جلوے اس تقریظ میں جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح کر دوں کہ مرزا غالبؔ نے حکیم مولا بخش قلق میرٹھی سے اپنی فرمایش پر لکھوایا تھا۔ جب کہ قلق میرٹھی حکیم مومن خاں مومنؔ کے تلامذۂ خاص تھے۔ قلق میرٹھی کے انگریزی نظموں کے اُردو تراجم ''جواہر منظوم'' اشاعت 1867 پر نظر ثانی ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم کے استفسار پر مرزا غالبؔ نے کی تھی۔ قلق میرٹھی کے یہ انگریزی تراجم بعد کی نسل کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ میں اس موقع پر ''عود ہندی'' کے لیے لکھی گئی قلق میرٹھی کی تقریظ سے ایک مثنوی اور ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں؛ تا کہ قارئین خود اندازہ لگا سکیں کہ مرزا غالب کے کلام کے ساتھ ساتھ باشندگانِ میرٹھ کے علاوہ شعرا و ادبا مرزا غالبؔ سے والہانہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ عود ہندی پر لکھی گئی تقریظ سے قلق میرٹھی کی مثنوی ملاحظہ کیجیے:

لکھے کیا کوئی فکر اوج غالبؔ
بیاں سے دور حرف ذکر غالب
سخن دانی اگر ہوئے کوئی دیں
تو ایماں سب کا ہو غالبؔ کا آئیں
عجب انداز نکتہ پروری ہے
کہ ہر نقطہ کتاب دائری ہے
اگر روشن بیانی وہ دکھائے
تو مہر و مہہ کو نظروں سے گرائے
سواد قدس شکل نامہ اُس کی
قم عیسیٰ، صریر خامہ اُس کی
طبیعت کا جو پائے اُس کی انداز
نزاکت کو ہو کیا کیسا ناز و ناز
جو زہرِ خندہ اُس کے لب پہ جا پائے
تو قیس درد نوش جان بن جائے
اگر یہ خود سری کا مدعی ہو
تو دریا تک سے عاد قطر گی ہو
نہیں اس کا سخن میں کوئی ہم دوش
کہ اک حرف اُس کا اور معنی صد آغوش
سخن کا مجملاً ہو اُس کے کیا ذکر
ہر اک نقطہ ہے جس کا محشر فکر 26ے

قلقؔ میرٹھی نے اپنی تقریظ کے آخر میں مرزا غالبؔ کی دل کو چھو لینے والی نثر نگاری پر اظہارِ خیال پیش کرتے ہوئے لکھا:

''مآل ہرزہ درانی وآشفتہ نوائی قلق ناسنجیدہ بیان، کج مج زبان کا یہ کہ اس ستودہ کیش قدر اندیش نے کس عمدہ عنوان سے فضیلۂ طبیعت مرزا غالبؔ یعنی خطوط ہائے پریشاں اُردو زبان کو روحِ رواں اور مغز جاں بنا دیا اورکس عبارتِ بے سر و پا سے کیسا باغستان معنی کھلا دیا۔حق یہ ہے کہ ایسی سعی مشکور ومحنت دراز ودورکون کسی کے لیے کرتا ہے۔ ہرایک اپنی جیب وگریبان کوگلہائے مقصود سے بھرتا ہے۔یہ آپ ہی کا کام ہے اس کا نام رابطہ خاص اوراخلاقِ عام ہے۔جب طالبانِ زبان اس تحریرکوملاحظہ فرمائیں گےتو دلّی کا روزمرہ اُردواورمحاورۂ گفتگوگھر بیٹھے سیکھ جائیں گے۔

بارک اللہ! کیا بے ساختہ عبارت ہے کہ نثر میں نظم کا مزہ آتا ہےاور ہر جملہ فقرۂ معشوق کوشرماتا ہے۔مگرافسوس اہل مشرق کی جگت بندی نے بگاڑا کہ دلی سے زیادہ اُس کی زبان کو اُجاڑا۔اب کس کس کوسمجھایئے۔کافی دل و دماغ کہاں سوائے ازین ان کو فہم ،ہم کو فراغ کہاں۔شعر

ہائے دہلی کہ دشوار بیان دہلی
لٹ گئی ساتھ ہی دہلی کے زبان دہلی

27ؔ

اس طرح مرزاغالبؔ کی ذاتی زندگی اورادبی زندگی میں خطۂ میرٹھ نےکلیدی کردارادا کیا۔انیسویں صدی کے وسط کے بعدمرزا غالبؔ نے اُردونثر میں نئی روح پھونکی۔ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ ''عود ہندی'' ان کی زندگی میں شائع ہوا۔ان کے

خطوط کا دوسرا مجموعہ ''اُردوئے معلیٰ'' ان کی وفات کے 19 دن بعد جواہر سنگھ جوہر کی کاوشوں سے مارچ 1869 میں منظرِ عام پر آیا۔البتہ مرزا غالب کا کلام ان کی زندگی میں ہی پانچ مرتبہ شائع ہوا۔پہلی بار 1841 ، دوسری بار 1847 ، تیسری بار 1861 ، چوتھی بار 1862 ، پانچویں بار 1863 میں ۔مرزا غالب کا اُردو دیوان جو 1861 میں شاہ درا، دہلی سے شائع ہوا، پہلے وہ میرٹھ سے ہی شائع ہونا تھا۔لیکن بعضِ وجوہات کی بنا پر مرزا غالب نے اسے واپس منگوالیا۔بہر حال! میرٹھ سے مرزا غالب کا ہمیشہ لگاؤ بنا رہا۔اس کی ایک خاص وجہ ان کے پرستار اور مداح میرٹھ میں رہتے تھے۔جو انھیں یہاں کی ادبی سرگرمیوں سے واقف کراتے رہتے تھے۔مرزا غالب نے بھی میرٹھ کے علمی اور ادبی شعورِ نقد کی قدر کی۔اس مضمون کو میں بیسویں صدی کے وسط سے قبل اور وسط کے بعد میرٹھ کے ادیبوں کی جانب سے مرزا غالب کی نثر اور شاعری پر تحریر کردہ کتابوں کے حوالوں کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔سب سے پہلے میں فرانسیسی نژاد شاعر اور میرٹھ کے نامور ادبی شخصیت جارج پیش شور (1823-1894) کے قطعۂ تاریخ کو قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں جو انھوں نے مرزا غالب کی وفات کے بعد لکھا تھا۔جارج پیش شور میرٹھ کے صاحب دیوان شاعر تھے۔مرزا غالب سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔انھوں نے غالب کو چراغِ دہلی'' کے خطاب سے بھی نواز تھا۔1857 کی غدر میں انھیں ترکِ وطن کرنا پڑا تھا۔غالب کی وفات پر کہے گئے ان کے قطعات دو اُردو میں اور دو فارسی میں ملتے ہیں:

افسوس کہ غالب سخن مدا
یہ حادثہ دہلی میں نیا اور ہوا
تاریخ جو اس کی میں نے چاہی اے شور
ہاتف نے کہا چراغ دہلی کا بجھا

۱۲۸۵ھ

شورِ ہاتف نے سرِ حیرت اوٹھا کر یہ کہا
پُر ہوا پیمانہ اسد اللہ بادہ خوار کا

28ے

سر زمین میرٹھ آنکھیں کھولنے والے اُردو ادب کے قد آور ادیب ، ماہر لسانیات، محقق، ناقد، شاعر، مدیر اُردو لغت، ترقی اُردو بورڈ، کراچی، ڈاکٹر شوکت سبز واری (1908-1973) نے ''غالب فکر و فن'' شائع کُل پاکستان انجمن ترقی اُردو، کراچی، 1961 لکھ کر صحیح معنوں میں مرزا غالبؔ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔اس سے قبل ڈاکٹر شوکت سبز واری ''فلسفۂ کلامِ غالبؔ'' جیسی معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کر چکے تھے۔ یہ کتاب قومی کتب خانہ بریلی سے شائع ہوئی تھی۔گزارشِ احوالِ واقعی کے آخر میں 3 مارچ 1946 کی تاریخ درج ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبز واری نے ''پیش کش'' کے تحت لکھا:

''میں اپنی اس ناچیز تصنیف کو عالی جناب معلّٰی القاب جناب سیٹھ گوپی ناتھ صاحب رئیس اعظم میرٹھ کے نام معنون کر رہا ہوں، جن کی رفعت فکر، بلندیٔ کردار اور میرے ادبی مشاغل سے غیر معمولی دل چسپی نے علم و ادب اور شعر و حکمت کی تاریک راہوں کو میرے لیے روشن کر دیا ہے۔

وہی ایک چیز ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

شوکت سبز واری'' 29ے

حواشی:

1۔میرٹھ کی کمبوہ ریاست تاریخ کے آئینے میں، غیر مطبوعہ مضمون، صفحہ اول

2۔بیان میرٹھی اور غالبؔ، ڈاکٹر صرف الدین ساحل، مومن پورا ناگ پور، اشاعت 1997، صفحہ 43

3۔غالبؔ کے خطوط ،مرتب ڈاکٹر خلیق انجم،، غالب انسٹی ٹیوٹ ،نئی دہلی ،جلد اوّل، 2011، صفحہ 309

4۔ایضاً، 309

5۔ایضاً، صفحہ 318

6۔ایضاً، صفحہ 318

7۔ایضا، صفحہ 501

8۔ایضا، صفحہ 326-325

9۔غالبؔ اور صفیر بلگرامی، مشفق خواجہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، 1985، مشمولہ، حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی، ڈاکٹر راحت ابرار، 1999، صفحہ 13

10۔میرٹھ کی ادبی خدمات، محمد مشتاق شارقؔ ناشر ایس۔ایم اخلاق، کوٹلہ گھنٹہ گھر، میرٹھ، 2014، صفحہ 88-87

11۔ایضاً، صفحہ 88

12۔ غالب کے خطوط ،مرتب ڈاکٹر خلیق انجم،، غالب انسٹی ٹیوٹ ،نئی دہلی ،جلد سوم، چوتھا اڈیشن، 2016، صفحہ 1081 تا 1082

13۔ایضاً، صفحہ 547

14۔ایضاً، صفحہ 548

15۔غالب کے خطوط ،مرتب ڈاکٹر خلیق انجم،، غالب انسٹی ٹیوٹ ،نئی دہلی ،جلد سوم، چوتھا اڈیشن، 2016، صفحہ 1084

16۔حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی،ڈاکٹر راحت ابرار،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی، سن اشاعت1999،صفحہ 103

17۔رسالہ دریافت،مدیر اعلا بریگیڈیئر عزیز احمد خان ریکٹر نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،اسلام آباد،جون2002،صفحہ 12 تا13

18۔غالب کے خطوط،مرتب ڈاکٹر خلیق انجم،،غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی،جلد دوم،، 2006،صفحہ 565

19۔ایضاً،صفحہ 838

20۔میرٹھ کی ادبی خدمات،محمد مشتاق شارقؔ،کوٹلہ گھنٹہ گھر،میرٹھ2014،صفحہ 121

21۔خط بنام مرزا رحیم بیگ،غالب کے خطوط،مرتب ڈاکٹر خلیق انجم،جلد چہارم، صفحہ1474 تا1488

22۔علامہ سید احمد حسن فرقانی وشاکیؔ از سید علی جواد زیدی مطبوعہ نیا دور جنوری1956، صفحہ 71

23۔غالب کے خطوط،مرتب ڈاکٹر خلیق انجم،،غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی،جلد دوم،، 2006،صفحہ 730

24۔ماہ نامہ لسان الملک بابت دسمبر1895،جلد9،مشمولہ میرٹھ کی ادبی خدمات،محمد مشتاق شارقؔ ناشر ایس۔ایم اخلاق،کوٹلہ گھنٹہ گھر،میرٹھ،2014،صفحہ 155

2 5۔غالب کے خطوط،مرتب ڈاکٹر خلیق انجم،جلد اول،غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی،2011،صفحہ 25 تا26

26۔اُردو کا کلاسیکی ادب،کلیات قلقؔ،مرتب کلب علی خاں فائق مجلس ترقی ادب لاہور،طبع اول،دسمبر1966 صفحہ 904

27۔ایضاً،906 تا907

28۔1857کے انقلاب کا عینی شاہد جارج پیش شورؔ،ڈاکٹر راحت ابرار۔ایجوکیشنل

پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2010 صفحہ 139
29۔فلسفۂ کلام غالب قومی کتب خانہ بریلی، 1946، صفحہ 5

☆☆☆

تفہیم غالب اور شمس الرحمٰن فاروقی

غالب کے اپنے عہد میں ان کی شاعری اگر چہ پوری طرح مسترد نہیں کی گئی۔لیکن تنقیدوں کا شکار ضرور رہی جس کی وجہ ان کے کلام کی بالواسطہ ساخت،مشکل لفظیات،ابہام اور اسلوب کی پیچیدگی تھی۔لیکن غالبؔ کے شاگرد اور سوانح نگار حالی نے ان کی شاعری کو عام قاری کے لیے بہت حد تک قابل فہم بنادیا۔بعدازاں متعدد ادیبوں اور نقادوں نے اپنے اپنے زمانے کے ادبی اصولوں کی روشنی میں کلام غالب کو قابل فہم بنانے اور اس کے حسن کو نمایاں کرنے کی بہت حد تک کامیاب کوششیں کیں۔اردو میں غالب ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔اس سلسلے میں ایک اہم اضافہ فاروقی کی کتاب ''تفہیم غالب'' ہے حالانکہ یہ کتاب غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔لیکن یہ تحریریں رسالہ شب خون میں ۱۹۶۸ء سے ۱۹۸۸ء تک قسط وار اشاعت پذیر ہوتی رہیں۔

مطالعات غالبؔ کی تاریخ میں ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء خاص اہمیت رکھتا ہے۔۱۹۶۹ء میں غالبؔ کی صدسالہ برسی دنیا بھر میں جگہ جگہ منائی گئی۔لیکن غالبؔ صدی تقریبات اور تصنیفات کا سلسلہ ۱۹۶۸ء میں شروع ہو گیا تھا۔۱۹۶۸ء کے شروع میں فاروقی صاحب کو خیال آیا کہ ''شب خون'' الہ آباد کی طرف سے غالب کو خراج عقیدت یوں پیش کی جائے کہ اس کے ہر شمارے میں غالب کے کسی شعر پر گفتگو کی جائے اور شرط یہ رکھی کہ اظہار خیال کے لیے وہی شعر منتخب ہوں جن میں کوئی ایسا نکتہ ہو جو عام شارح سے نظرانداز ہو گیا ہو یا جن کی شرح میں کوئی ایسی بات کہنا ممکن ہو جو متداول شرح سے ہٹ کر ہو۔چنانچہ شب خون کے شمارہ نمبر۲۳ بابت ماہ اپریل ۱۹۶۸ء سے تفہیم غالب کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ کچھ اس قدر مقبول ہوا کہ

ڈاکٹر ارشد جمیل،ڈائٹ لکچرر (اردو)،مہاراج گنج،یوپی

غالب صدی تقریبات کے اختتام پذیر ہونے کے بعد بھی قائم رہا۔اس سلسلے کی آخری تفہیم ''شب خون'' شمارہ ۱۵۱ بابت ماہ ستمبر نومبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔گویا تفہیم غالب کے عنوان سے جو کتاب منظر عام پر آئی اس کی مدت تصنیف بیس سال سے کچھ اوپر ہے۔حالانکہ ''تفہیم غالب'' غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔

فاروقیؔ نے اس کتاب میں غالب کے تمام اشعار کو شامل نہیں کیا ہے ۔صرف ان اشعار کو ہی موضوع گفتگو بنایا ہے جن میں کسی بھی اعتبار سے بحث ومباحثے کی گنجائش سمجھی گئی۔گویا کہ تفہیم غالب میں صرف منتخب اشعار کو ہی شامل کیا گیا ہے۔''شب خون'' میں اشعار کی شرح جس طرح ہوتی رہی اس کی باضابطہ اشاعت کے وقت فاروقیؔ نے اس میں ضروری اضافے اور ترمیم کے ساتھ اس کی زبان کو آسان بنانے کی طرف توجہ دی ہے نیز کئی اعتبار سے اس کی تحریروں پر مزید غور وفکر سے کام لے کر ازسرنو پیش کیا ہے۔فاروقیؔ کی مشرقی ومغربی ادبیات پر گہری نظر ہے۔تفہیم غالب کی تصنیف کے وقت انھوں نے اپنے اردو فارسی اور انگریزی کے مطالعے سے گہرا استفادہ کیا ہے۔

تفہیم غالب کے دوسرے ایڈیشن میں بارہ اشعار کی تفہیم کا اضافہ ہونے کے بعد اشعار کی تعداد بڑھ کر ڈیڑھ سو ہوگئی ہے۔اشعار کی تشریح نہایت تفصیلی اور مکمل بحث کے ساتھ کی گئی ہے اور ایک ایک بات کو بڑے بھرپور وزن اور دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔فاروقیؔ نے پورے دیوان غالب کا مطالعہ کر کے جن اشعار کو زیادہ قابل تشریح سمجھا انھیں شرح میں پیش کر دیا ہے۔غرض یہ کہ تفہیم غالبؔ، غالبؔ کے منتخب اشعار کی شرح کے اعتبار سے کلام غالب کا ایک ایسا آئینہ کہا جا سکتا ہے جس میں ہر بات صاف دکھائی دیتی ہے اور شارح کی

مفصل بحث کی روشنی میں جہاں اسے کلام غالب پر ایک متوازن تنقید کا نام دے سکتے ہیں تو وہاں غالبیات میں ایک اچھوتی اور نئی تصنیف کہا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ غالب ہمارے ان شاعروں میں ہیں جن کے کلام کی متعدد تشریحات وتعبیرات ہوتی رہی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ غالب کے اپنے عہد میں ہی ان کی شاعری پر اگر چہ پوری طرح توجہ نہیں دی گئی لیکن تنقیدوں کا شکار رہی جس کی وجہ ان کے کلام کی بالواسطہ ساخت، مشکل لفظیات، ابہام اور اسلوب کی پیچیدگی تھی۔ لیکن غالب کے شاگرد اور سوانح نگار مولانا حالی نے ان کی شاعری کو عام قاری کے لیے بڑی حد تک قابل فہم بنانے کی کوشش کی۔ بعد ازاں متعدد ادیبوں اور نقادوں نے اپنے اپنے زمانے کے ادبی اصولوں کی روشنی میں کلام غالب کو قابل فہم بنانے اور اس کے حسن کو نمایاں کرنے کی کسی حد تک کامیاب کوشش کی۔ اس سلسلے میں فاروقیؔ کی کتاب "تفہیم غالب" نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ فاروقیؔ وہ پہلے نقاد ہیں جنھوں نے الفاظ کے سیاق وسباق کی نہ صرف وضاحت کی بلکہ تاریخی پس منظر میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے ہر شعر میں استعارہ اور ابہام کی سطحوں تک کی وضاحت کی ہے اور ثابت کیا کہ شعر میں ایک ہی معنی نہیں ہوتے بلکہ اس میں معنی کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ حالانکہ فاروقیؔ نے کم از کم بیس پیش رو شارحین غالب سے رجوع کیا ہے پھر بھی ان کی شرح ان سب سے قطعی مختلف ہے۔ غالب کے یہاں مستعمل غیر واضح اور مبہم فقروں کی توضیح کے لئے فاروقیؔ نے معیاری لغت اور شاعرانہ اظہار وبیان کی فرہنگوں سے مدد لی ہے اس طریقہ کار کے ذریعہ فاروقیؔ نے نہ صرف کلام غالب کی نئی تعبیر کی ہے بلکہ ان کی شرح ماقبل شرحوں پر تنقید وتبصرہ کا حکم رکھتی ہے۔ بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ اس کتاب کے قاری کو اس سے پہلے کہ ان بیس شرحوں کو اپنے پاس

رکھنے کی ضرورت ہے جن کو فاروقی نے نگاہ میں رکھا ہے لہٰذا فاروقی کی کتاب گزشتہ شارحین سے آگے بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

فاروقی نے غیر معمولی حساس طبعی سے کام لیکر صفحات پر لکھے ہوئے ''منقوش الفاظ'' کواس طرح پڑھا ہے کہ متن میں چھپی ہوئی طنزیہ ایمائیت اورغالب کے ذہن کی قول محال سے بھرپور گہرائیاں پوری طرح نمایاں ہوگئی ہیں۔دیوان غالب کے پہلے ہی شعر کومنتخب کرکے انھوں نے اپنے مخصوص استدلالی انداز میں شرح کی ہے اورشعر کے بارے میں طبع طباطبائی کے فیصلے کورد کرتے ہوئے کہ ایران میں یہ رسم کی دادخواں کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے شعر میں نئی معنویت پیدا کرنے کے لئے انھوں نے شعر کی صوتی آہنگ اورالفاظ کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی ہے ۔ فاروقی نے غالب کی شعریات سے ان مجردالفاظ، پیکروں، استعاروں اور علامتوں کی طویل فہرست دی ہے اوراس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ شعر گوئی کے دوران غالب کس طرح لفظ کا انتخاب کیا کرتے تھے ان کے محاکات، تشبیہات، استعارے کہاں سے اورکس طرح ظہور کرتے تھے اور پھران کے شعوری استعمال سے کس طرح کا جہان معنی بناتے تھےاوران سب کی ہمارے عہد میں کیا اہمیت ہے۔ظاہر ہے کہ تفہیم غالب میں فاروقی نے منتخب اشعار کی تشریح کی ہے انتخاب اشعار میں انہوں نے آزادانہ رویہ اختیار کیا ہے۔انہوں نے غالب کے مشہوراوراہم اشعار کی تشریح کی ہے اوراکثر شارحین کے معنی ومفاہیم پر بحث وتجزیہ کرکے اشعار کے مخفی مفہوم،مبہم تصور کو عالمانہ بصیرت اورفکری دلائل کے ساتھ نمایاں کرکے تفہیم غالب اورجدیداردوتنقید میں بے مثال کارنامہ انجام دیا ہے۔

فاروقی نے کم ازکم بیس پیش روشارحین غالب سے رجوع کیا ہے پھر بھی

ان کی شرح ان سب سے قطعی مختلف ہے غالب کے یہاں مستعمل غیر واضح اور مبہم فقروں کی توضیح کے لیے فاروقی نے معیاری لغات اور شاعرانہ اظہار و بیان کی فرہنگوں سے مدد لی ہے دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس میں غالب کے اشعار کو سنین کے ساتھ رقم کیا گیا ہے۔ تفہیم غالب یا غالب شناسی کا سفر کم و بیش غالب کے زمانے سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ مگر تفہیم غالب کی اشاعت کے بعد نہ صرف مطالعہ غالب کا ایک نیا باب کھل گیا بلکہ اس سمت میں شرط یہ رکھی گئی کہ اظہار خیال کے لیے وہی شعر منتخب ہوں جن میں کوئی ایسا نکتہ ہو جو عام شارح سے نظر انداز ہو گیا ہو، یا جن کی شرح میں کوئی ایسی بات کہنا ممکن ہو جو پچھلے شارحین سے الگ ہو چنانچہ شب خون کے شمارہ ۲۳ بابت ماہ اپریل ۱۹۶۸ء سے تفہیم غالب کا سلسلہ شروع ہوا اور اس قدر مقبول ہوا کہ اس سلسلے کی آخری تفہیم شب خون شمارہ ۱۵۱ بابت ماہ ستمبر نومبر ۱۹۸۸ء تک چلتا رہا۔ گویا تفہیم غالب کی مدت تصنیف بیس سال کے عرصے پر محیط ہے۔ لیکن اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی اشاعت سے قبل فاروقی نے غالب کے اشعار سے متعلق اپنی تمام تفہیمات پر از سر نو غور کر جہاں ترمیم اور اضافے کی گنجائش تھی اس میں ردوبدل و اضافہ کیا بعض باتوں کو حذف کر دیا، بعض جگہوں پر وضاحت کر دی، بعض پہلوؤں پر تاکید بڑھا دی بعض پر کچھ کم کر دی۔ زبان میں بھی سلاست اور روانی پیدا کر دی یعنی تفہیم غالب شب خون میں شائع ہونے والی تحریروں سے جگہ جگہ لفظاً اور کئی جگہ معناً مختلف ہے۔

تفہیم غالب لکھتے وقت فاروقی نے اگر چہ اپنے پیش رو شارحین سے اکتساب کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان سے شدید اختلاف بھی کیا ہے فاروقی نے سب سے زیادہ اکتساب اور اختلاف نظم طباطبائی سے کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بقول فاروقی نظم طباطبائی نے لکھنوی تعصب کے بنا پر غالب کے ساتھ وہ انصاف نہیں کیا جس کے

وہ مستحق تھے اور بعض جگہوں پر نظم طباطبائی سے ایسے تسامحات سرزد ہوئے ہیں جس سے غالب کی شاعرانہ شان کو ذک پہنچا ہے۔تفہیم غالب میں ایک جگہ مزید فرماتے ہیں کہ آفریں ہے طباطبائی پر، کہ ایک طرف تو انہوں نے کلام غالب کی نکتہ رسی میں وہ معیار قائم کیا ہے کہ اچھے اچھے اس تک نہ پہنچ پائے اور دوسری طرف انہوں نے غالب پر نکتہ چینی ،حتیٰ کہ غالب کی تحقیر کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔اس کے علاوہ فاروقی کو اپنے پیش رؤں سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے اشعار غالب کی تفہیم کے وقت لغات سے رجوع نہیں کیا اور بعض الفاظ کے لغوی اور اصطلاحی معنی کی اہمیت سے تعرض کر کے غلط فہمیاں پیدا کی ہیں۔تنقید ہو یا تفہیم فاروقی اپنا نظریہ یا نقطۂ نظر سامنے لاتے وقت ایسے دلائل پیش کرتے ہیں کہ کسی اختلاف کی خفیف گنجائش باقی نہیں رہتی ان کا استدراک، اعتراض، اختلاف بھرپور علمی بصیرت پر مبنی ہوتا ہے اور وہ کسی بھی حال میں محاکمہ کرتے ہوئے معروضیت کے دائرے سے باہر نہیں آتے، بقول پروفیسر احمد صدیقی :

> ''ان کی تحریروں سے ان کی دقت نظر وسعت معلومات اور خود اعتمادی پوری طرح سے ظاہر ہوتی ہے..........شمس الرحمٰن کے یہاں ہمیں اکثر ایسے جملے اور فقرے مل جاتے ہیں جن کو پڑھ کر چونک جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔مگر وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کے لیے ان کے پاس پورے ثبوت اور مثالیں بھی ہوتی ہیں کہ چونکنے کے بعد ہم سوچنے پر

بھی مجبور ہو جاتے ہیں''۔[1]

(اردو غزل کے اہم موڑ۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ غالب اکیڈمی۔

دہلی۔۲۰۰۶ء۔ص۔۷۔۹)

فاروقی نے کلام غالب کی شرح کچھ اس انداز سے کی ہے کہ قاری کے پاس چونک جانے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں بچتا۔ جن لوگوں نے فاروقی سے پہلے کی غالب کی شرحوں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ فاروقی کا طریقہ کار استدلالِ علم اور شعر شناسی بے مثال ہے۔ فاروقی نے اگر چہ غالب کے منتخب اشعار کی تفسیر کی ہے مگر جگہ جگہ پر زبان و بیان اسلوب و شعر شناسی کے فن وغیرہ پر علم کا ایک دریا بہا دیا ہے۔ فاروقی نے تفہیم غالب لکھ کر غالب کو نہ صرف زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے، بلکہ کلام غالب کو صحیح تناظر میں سمجھنے میں ہماری رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیا ہے، بلکہ غالب کے فنی کمالات کی سیر بھی کرائی ہے۔ وہ تشریح کے وقت کلام غالب میں استفہام، مناسبت معنوی، قول محال حسن بیان، بدیع استعارہ، رعایت، نازک خیالی، ترصیع آہنگ، مضمون آفرینی، جیسے شعری محاسن سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاروقی نہ صرف شارح کی حیثیت سے اپنے منصب سے انصاف کرتے ہیں بلکہ ایک نقاد کے طور پر بھی اپنی موجودگی کا احساس کراتے ہیں۔ سید ابوالخیر محمد کشفی ان کی ناقدانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

> ''ادب کے بنیادی مباحث سے الجھنا تنقید کا ایک منصب اور فریضہ ہے۔ فاروقی نے یہ کام بھی سرانجام دیا ہے مگر ان کے شعر فہمی اور شعر کے متن سے دلچسپی کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ آج کے بیشتر نقاد شعر و ادب پر گفتگو کی لال

ہری جھنڈیوں کی نمائش تو خوب کرتے ہیں۔لیکن ان
سے کسی شعر کے معانی،اس کی مختلف پہلوؤں اور
تہوں کی بات کی جائے تو جواب میں خاموشی ہوگی یا
ماتھے پر پسینہ نظر آئے گا،فاروقی اس منزل سے
بامراد گزرے ہیں''۔۲

(کاروان ادب،خصوصی شمارہ،شمس الرحمٰن فاروقی،بھوپال پرنٹرس اینڈ پبلیشرس،بھوپال،۲۰۰۳ء،ص۲۴۲)

فاروقؔی نے غالب کو تفہیم غالب میں ''غیر معمولی شاعر'' قرار دیا ہے۔جس سے کلام غالب کی قدر و قیمت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ متعدد ادیبوں اور نقادوں نے کلام غالب کو قابل فہم بنانے کی کوششیں کیں مگر آج تک غالب کو پوری طرح سے سمجھنے اور سمجھانے کا حق ادا نہ ہوسکا۔اس سلسلے میں فاروقؔی کی کتاب ''تفہیم غالب'' ایک اہم اضافہ ہے جس میں کلام غالب کی معنویت، گہرائی اور حسن کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔غالب اردو کا ایک ایسا شاعر ہے جس کے کلام فہمی کے سلسلے میں لاتعداد تنقیدی مضامین، درجنوں شرحیں دیوان غالب اور نامور محققوں مثلاً قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی اور مالک رام وغیرہ کے تحقیقی کارناموں نے کلام غالب کی تشریح تعبیر اور تنقید میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔لیکن اس کے باوجود فاروقی کی کتاب ''تفہیم غالب'' غالب کے فکری رویے شعری آہنگ اور لب ولہجہ کی تفہیم کا ایک امتیازی ادبی سرمایہ ہے جس میں کلام غالب کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ظاہر ہے یہ ایک نہایت مشکل کام تھا جسے فاروقؔی جیسے ذہین صاحب قلم کی ہی ضرورت تھی۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کی فاروقؔی نے تفہیم غالب میں

اشعار کے الفاظ کا باریک جائزہ لے کر اشعار میں پنہاں مشکل ترین گنجینۂ معنی کی وضاحت کی ہے اور کامیاب ترین انداز میں ان منتخب اشعار کی توضیح وتشریح کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہونچایا ہے۔ بلاشبہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تفہیم غالب غالب کی تفہیم کے ساتھ ہی اردو شعریات کے لئے نئی راہیں دکھاتی ہے۔

غالبؔ کی آفاقیت

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵؍فروری ۱۸۶۹ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہوگیا اور ان کی پرورش چچا نصراللہ بیگ کے ذمے ہوگئی کچھ دنوں بعد چچا بھی راہی ملک عدم ہوئے تب غالبؔ ننھیال کی سرپرستی میں آگئے۔ ۱۸۱۰ء میں تقریباً تیرہ برس کی عمر میں انکا نکاح ہوا اس کے بعد انھوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مگر آمدنی کا کوئی خاص اور مستقل ذریعہ نہ تھا وظیفے پر گزر بسر ہوتا رہا۔ ۱۸۵۰ء میں شہنشاہِ ہند بہادر شاہ ظفرؔ نے تاریخِ تیموریہ ''مہر نیم روز'' لکھنے کی ذمہ داری سونپی اور پچاس روپیہ ماہوار کے علاوہ نجم الدولہ و دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب سے بھی نوازا۔ ۱۸۵۴ء میں استاد ذوقؔ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ نے غالبؔ سے اصلاح لینی شروع کر دی تو غالبؔ کو استادِ شاہ کا مقام حاصل ہوا اور حالات کچھ بہتر ہوئے کہ اچانک ۱۸۵۷ء کا غدر واقع ہوگیا۔ پھر وہ سب کچھ ہوا جو کسی نے کبھی سوچا نہ تھا۔ گویا ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد قلعے کا وظیفہ بند ہوا انگریزوں سے ملنے والی پینشن بھی بند ہوئی۔ غالبؔ کی زندگی انتہائی تنگ ہوگئی ۔روزمرہ کی ضروریات کے لئے برتن اور کپڑے بھی بیچنے پڑے۔ ان کے اور ۱۸۵۷ء کے بعد کے ناگفتہ بہ حالات کو ''دستنبو'' میں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اپنی کسمپرسی جب غالبؔ نے نواب رامپور یوسف علی خاں کو بتائی اور مستقل وظیفے کی درخواست کی تو انھوں نے 100 روپئے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیئے جو غالبؔ کو تاحیات ملتے رہے۔ غالبؔ کی ممکنہ کوشش کی ناکامی کے بعد انگریزوں سے ملنے والی پینشن نواب رامپور کے توسط سے ہی بحال ہوئی۔ غالبؔ نواب

ڈاکٹر عبدالحفیظ (اسکول آف ہیومنٹیز)، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی

رامپور کے زندگی بھر احسان مند رہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب نواب یوسف علی خان کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں جانشیں ہوئے تو تہنیت کے لئے غالبؔ نے رامپور کا سفر کیا۔ جبکہ انھوں نے طویل سفر سے گریز کرتے ہوئے پوری زندگی دہلی میں گزاری صرف ایک بار اپنے وظیفے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر کیا تھا اسی سفر کے دوران متعدد شہروں میں مختصر قیام رہا اس کے علاوہ انھوں نے کوئی سفر نہیں کیا۔

غالبؔ کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا مگر انہوں نے شاعری کا شغل اختیار کیا۔ غالبؔ کا ذہن اپنی عمر سے زیادہ پختہ تھا۔ غالبؔ نے چودہ برس کی عمر تک فارسی زبان پر مکمل دسترس حاصل کر لی تھی اور بعد میں ہندوستان میں فارسی شاعری کو غالبؔ ہی نے اونچائیوں پر پہنچایا۔ وہ خود اپنے فارسی قصائد اور غزلوں پر ناز کرتے تھے مگر ان کو شہرتِ دوام اردو شاعری کی بنا پر ملی۔ زندگی اور اس کے متعلق تمام تجربات کا نچوڑ ان کی شاعری میں ملنے کی وجہ سے دیوان غالبؔ کو الہامی کتاب تک کا درجہ دیا گیا۔ ''دیوانِ غالبؔ'' کے علاوہ مکتوبات کے مجموعے ہیں جس میں غالبؔ کے اپنے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے نام منفرد انداز کے خطوط شامل ہیں۔ ان کے خطوط میں مخاطب سامنے بیٹھا ہوا نظر آتا ہے اور گفتگو ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کوئی القاب و آداب نہیں، کوئی تکلّف نہیں گویا تحریر میں تکلّم کا لطف ہے۔ اردو نثر میں ''عود ہندی''، ''مکاتیبِ غالب''، نادراتِ غالب''، ''نکاتِ غالب''، رقعاتِ غالب''، ''قادر نامہ''، ''انتخاب غالب''، ''نامۂ غالب'' اور تیغ و تیز تصانیف گنج گراں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ غالبؔ کا اردو دیوان انکی زندگی ہی میں چھ بار شائع ہو گیا تھا۔

شاعری ہو یا نثر ہر میدان میں غالبؔ نے اپنی انفرادیت اور علمیت کا لوہا منوایا۔ خداداد ذہانت، فکر کی گہرائی اور اندازِ بیان، فلسفہ اور علمیت، فنی نزاکت اور بے

مثال تخلیقی قوتوں کے استعمال سے غالبؔ نے اردو شاعری کو عالمی ادب کی صف میں نمایاں مقام دلوایا اور منفرد شناخت قائم کی۔ اسی لیے یہ بات صد فیصد صحیح لگتی ہے کہ اردو شاعری میں غزل کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں اور اردو غزل میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کا جو مقام و مرتبہ ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کا نہیں۔ غالبؔ جیسے شاعر صدیوں میں ایک پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا نے انکی فکری و فنی عظمتوں کا اعتراف کیا۔ اس لیے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس عظیم شاعر ہی کی بدولت اردو شاعری معراج پر پہنچی۔ انھوں نے فارسی میں بھی شاعری کی۔ قصائد، قطعات اور رباعیات بھی کہیں مگر ان کی شہرت دوام اردو غزلوں کی وجہ سے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سادہ و سلیس خطوط نے بھی غالب کی مقبولیت میں چار چاند لگائے۔ غالبؔ سے پہلے اردو غزل کی دنیا بہت محدود تھی، معاملات حسن و عشق کی واردات کے سوا اس میں کچھ نہ تھا۔ غالبؔ نے زندگی کے مسائل پر غور کیا اور انھیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا اسی لئے ان کی شاعری عظیم ہی نہیں بلکہ آفاقی شاعری کے زمرے میں شمار کی جانے لگی اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ غالبؔ کی شاعری مسرت سے بصیرت تک کا سفر ہے۔ ان تمام کے باوجود غالب کو جو شکایت رہی کہ ان کو وہ مقام و مرتبہ نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے اور یہ بات سچ ہے کہ ان کی زندگی میں ان کے کلام کو سمجھنے اور صحیح طور پر ان کے خیالات کی گہرائی تک پہنچنے والے قاری بہت کم تھے اور عمر بھر اپنی غزلوں کی خاطر خواہ داد کو ترستے رہے۔ شاید اسکی وجہ پہلے دور کی شاعری میں ثقیل فارسی الفاظ اور مشکل تراکیب کا کثرت سے استعمال رہا۔ شروع کے زمانے میں اکثر و بیشتر اشعار مشکل، پیچیدہ ہیں ان پر فارسی اساتذہ خصوصاً بیدل اور عرفی کا گہرا اثر نظر آتا ہے جسکا غالبؔ نے اعتراف بھی کیا ہے۔

طرز بیدلؔ میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

عام طور پر غالبؔ کے ابتدائی دور کے اشعار کو پڑھ کر عام قاری اتنا لطف اندوز نہیں ہوتا جتنا کہ بعد کے زمانے کے اشعار سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ غالبؔ کے دوسرے دور کی شاعری میں فارسی تراکیب اور ثقیل الفاظ کی کمی، انسانی فطرت کی عکاسی اور عاشقانہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔ تیسرے دور میں زیادہ توجہ فارسی شاعری کی طرف ضرور رہی مگر اردو شاعری سے قطع تعلق بھی نہیں رہے اور اس زمانے کی بھی غزلیں نا قابلِ فراموش اور اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ چوتھا دور اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس دور میں غالبؔ نے پوری توجہ اردو شاعری پر دی اور متواتر غزلیں کہیں اس دور کی غزلوں میں طنز، شوخی وظرافت کا رنگ نمایاں، اندازِ بیان پختہ اور لطفِ زبان ہر جگہ نظر آتا ہے۔ جذبہ میں تخیل کی آمیزش کی وجہ سے اس دور میں ان کی انفرادیت بھی قائم ہوئی۔ آخری دور میں غالبؔ نے عام فہم، سادہ اور سلیس زبان میں شاعری کی اس دور میں ان کے کلام میں بندش کی چستی اور شوخی وظرافت کی پختگی نمایاں ہے اور ہر غزل مخصوص طرز ادا، حسنِ بیان اور لطف سے لبریز ہے۔

غالبؔ کے کلام کی اہم خصوصیات میں مشکل پسندی، انانیت، انفرادیت، شوخی وظرافت، فلسفہ، حسن وعشق کے نازک ترین جذبات وخیالات کا اظہار اور رمزیہ و استفہامیہ انداز شامل ہیں۔

مشکل پسندی کا الزام غالبؔ پر مسلسل لگتا رہا شاید اسکی وجہ مغلیہ سلطنت کا زوال اور برطانوی تسلط کا استحکام کا زمانہ تھا، کیونکہ گفتگو میں پردہ داری کا چلن عام تھا جس سے غالبؔ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لہٰذا اس زمانے کے غالبؔ کے کلام کو سمجھنے کے لئے دماغ سوزی کی ضرورت پڑتی ہے زندگی کی پیچیدگیوں کا یہ اثر ہونا لازمی

ہے۔کلام میں تہہ داری اور پیچیدگی عہد غالب کا تقاضہ تھا۔اس کی دوسری وجہ غالب کی فارسی دانی بھی رہی غالب کو فارسی زبان پر مکمل دسترس تھی اور وہ پوری زندگی اردو سے زیادہ فارسی کی طرف مائل رہے۔لہٰذا ان کے اردو کلام میں فارسی الفاظ و تراکیب کے در آنے سے بھی پیچیدگی کا احساس ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ معمولی اور آسان مضمون کو بھی انھوں نے اس طرح سے بیان کیا کہ اس میں مختلف جہتیں پیدا ہوگئیں۔فارسی کی طرف زیادہ مائل ہونے کی وجہ سے الفاظ کے انتخاب میں بھی ان کے یہاں دشوار پسندی کا عکس نظر آتا ہے خود غالبؔ کو بھی اپنی مشکل پسندی کا احساس تھا۔بطور مثال یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؂

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھا لے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

غالبؔ کی دشوار پسندی کی شکایت ان کے ایک ہم عصر طبیب و شاعر آغا جان عیشؔ نے ان الفاظ میں کی۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اسی طرح کی شکایتوں سے برہم ہوکر غالب نے یہ کہا ؂

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

غالبؔ کی شاعری میں انانیت کا پہلو بہت نمایاں ہے بڑے فنکاروں کی طرح ان کو بھی اپنی عظمت کا احساس تھا۔جس کا اظہار انھوں نے جا بجا کیا۔انھوں نے حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ہزار مشکلوں کے باوجود خود کو برتر ہی سمجھا اور دنیا کو اپنے طور پر محسوس کیا اور اسے شعری پیکر میں ڈھالا۔ان کے بہت سے اشعار میں خودستائی دیکھنے کو ملتی ہے۔غالبؔ کو نثر و نظم دونوں میں کمال حاصل تھا۔شاید اسی لئے انھوں نے کسی کو اپنا ہم سر نہیں سمجھا۔ایک خط میں لکھتے ہیں ''خدا کے واسطے داد دینا،اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے اگر ریختہ وہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔'' یہی بات ذیل کے اشعار میں بھی کہی:

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعر نغز گوئے خوش گفتار

ہنگامۂ زبوئ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

غالبؔ کو جب اپنی مشکل پسندی کا احساس ہوا تو پرانی روش سے ہٹ کر آسان اور عام فہم شعر کہنے لگے لیکن مروجہ شعری روایت کی ہو بہو پیروی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا،یہی وجہ ہے کہ اپنا طرز دوسروں سے جدا ہی رکھا۔ہمیشہ اپنی پسند و ناپسند کا خیال رکھا اور اپنا جداگانہ راستہ اختیار کیا۔الطاف حسین حالیؔ نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انھوں نے عام روش پر چلنے کو اپنے لئے عار سمجھا۔اگر یہ کہا جائے کہ غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا راز جدّت طرازی میں مضمر ہے تو غلط نہ ہوگا۔

معمولی خیال کوبھی انھوں نے جدّت طرازی کی بدولت پرلطف بنادیا۔جیسے ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

انسانی فطرت،نفسیات،اخلاق،تصوف،فلسفہ،عشق غرض ہرمیدان میں غالبؔ کا نادروا چھوتاپن محسوس کیاجاسکتا ہے۔مثلاً:

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

انھوں نے نئے الفاظ،نئی تشبیہات، نئے استعارات ونئی تراکیب اورنئی بندشیں بھی وضع کیں جس سے ان کے کلام میں تہہ داری پیدا ہوگئی اورمعنی کے مختلف جہات متعین ہونے لگےان کا یہ شعرکلام میں تہہ داری کی بہترین مثال ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

اور یہ بھی سچ ہے کہ الفاظ سازی کےفن میں مہارت کی وجہ سے غالبؔ کو انفرادیت و جدّت طرازی میں دنیا کے باکمال شعرا کی صف میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

غالبؔ کی شاعری کا ایک بڑا وصف شوخی وظرافت ہے۔شوخی وظرافت ان کی فطرت میں شامل ہے۔اسی بذلہ سنج طبیعت کی بناپر حالیؔ نے یادگارِغالب میں انھیں حیوانِ ظریف کہا۔غالبؔ نے اپنی شاعری میں طنزومزاح اورشوخی وظرافت کو

بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا۔ ان کی ظرافت کے سرچشمے ان کے درد و غم ہی سے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ انکے کلام میں پائی جانے والی شگفتگی کی تہہ میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا گہرا احساس ہے۔ انھوں نے اپنی ظرافت سے زندگی کے رنج و غم کو ہموار کیا، وہ ہجومِ غم میں بھی اپنا توازن نہیں کھوتے اور دردناک موضوع ہونے کے باوجود بھی اپنے انداز بیان کو شگفتہ رکھتے ہیں۔ ان کی ظرافت سب کو متاثر کرتی ہے چونکہ وہ سادگی سنجیدگی اور متانت کو برقرار رکھتے ہوئے کلام میں ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی ظرافت زیادہ متاثر کن ہوتی ہے۔

وہ اپنی ذات پر طنز و تمسخر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غالبؔ اپنے محبوب کو مزاحیہ انداز میں اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اور غالبؔ دنیا دار علما اور دہرا معیار رکھنے والے واعظوں پر بھی طنز کرنے سے بعض نہیں آتے، وہ کہتے ہیں۔

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ! اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

شوخی کی مثال دیکھئے:

وہ آئے گھر ہمارے خدا کی قدرت
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ظرافت کی مثال ملاحظہ ہو:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

مذکورہ گونا گوں خوبیوں کی بنا پر ہی کلامِ غالبؔ کو شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ غالبؔ کے بعد بہت سے شعراء نے ان کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی لیکن کسی کو بھی وہ مقام ومرتبہ میسّر نہ ہوا، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ غالبؔ اپنے مزاج میں شگفتگی وہمہ گیری کے ساتھ ساتھ قوتِ مشاہدہ اور شاعری کے متعلق ایک خاص نگہِ انتخاب رکھتے تھے اور شوخی وظرافت اور دردمندی کا ایسا جذبہ رکھتے تھے جو کسی دوسرے کے یہاں نہیں۔ غالبؔ نے اپنی شوخی وظرافت سے اردو نثر کو بھی خشکی سے بچایا۔ جبکہ اس سے پہلے اس قسم کی ظرافت ناپید تھی۔ اسی بنا پر خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے ان کے خطوط کو ناول اور ڈرامے سے بھی زیادہ دلچسپ بتایا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ صرف اپنی اردو فارسی شاعری ہی نہیں بلکہ اردو نثر کی وجہ سے بھی دنیا کے نمایاں ادیبوں کی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

غالبؔ اقبال کی طرح کوئی منظّم فلسفہ یا کسی خاص نظریے کے حامل نہیں تھے مگر ان کا مزاج فلسفیانہ ضرور تھا اور حیات وکائنات کے بارے میں ان کے مشاہدات وتجربات معنی خیز رہے۔ انھوں نے زندگی کے بہت سے رنگ دیکھے اس پر غور وفکر کیا اور ایک باشعور فلسفی کی طرح ردّعمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے اپنے فلسفیانہ مزاج کی بدولت ہی اردو غزل میں تفکر کو تغزل کے سانچے میں ڈھالنے کی نئی روایت قائم کی۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ سوال قائم کیا اور سوچنے پر مجبور کیا۔ جیسے:

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

غالبؔ ہر حال میں خوش رہنے والے رند صفت انسان تھے اور تصوف کو

زندگی کا اہم حصّہ سمجھتے تھے انھوں نے تصوف کے اسرار و رموز کو اس شعر میں پیش کیا ہے:

یہ مسائل تصوف، یہ تیرا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالبؔ نے انسانی فطرت اور نازک احساسات و تجربات کو بڑی شدّت سے محسوس کیا اور زندگی کی معنویت پر گرفت کو مضبوط کرنے میں غیر معمولی ذہانت اور بصیرت کا ثبوت پیش کیا۔ ان کے کلام میں انسانی تجربات کی رنگارنگی، بوقلمونی اور تنوع نظر آتا ہے۔ ان کے کلام کی آفاقیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ماضی کے متعدد عالمگیر انسانی تجربات کا عرفان رکھتے ہیں اور اسے اپنے ترسیلی پیکروں میں سمو دیتے ہیں۔ غالبؔ اس لئے بھی اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں کہ انھوں نے انسانی زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کی مؤثر تصویریں اپنی غزلوں میں پیش کیں۔ انھوں نے احساسات کی تخلیقی بازیافت کی۔ ان کی دیدہ دری، ژرف نگاہی اور بصیرت نے انھیں حیات انسانی کا مبصر بنا دیا۔ وہ فکر و فن کو سانچے میں ڈھالنا جانتے ہیں۔ انھیں تصور کی صورت گری آتی ہے وہ لفظ و معنی کے بازی گر بھی ہیں۔ ان کے کلام میں تجسس، تنہائی، انبساط، محبت اور غم کی پیکر تراشی کی خاصی مثالیں موجود ہیں۔ گویا غالبؔ کو ہر عہد کے انسان کے دھڑکتے دل کے تجربے کا ترجمان کہا جا سکتا ہے اور یہی غالبؔ کی آفاقیت ہے۔

کلام غالبؔ میں ''تعمیر گھر'' کا تصوّر

''گھر'' بنی نوع انسان کی بنیادی ضرورتوں میں ایک اہم ضرورت شمار کیا جاتا ہے جو ہر انسان کے لئے اس کی پناہ گاہ ہے۔ گھر انسان کی شخصیت کا عکاس بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنی چندروزہ فانی حیات میں بھی ہر انسان ایک گھر کی تعمیر و تشکیل کے لئے ضرور کوشاں نظر آتا ہے۔ انسان ہی نہیں بلکہ ہر ذی روح اپنے لئے ایک گوشۂ عافیت کی تلاش ضرور کرتا ہے جہاں پہونچ کر سکون وطمانیت محسوس کر سکے۔ گھر کا نہ ہونا کسی بھی حساس شخص کے لئے بہت بڑا دکھ بن جاتا ہے۔ ''مکان'' سے ''گھر'' تک کا تصور موضوع بن کر ہمیں جابجا ادب میں بھی بکھرا نظر آتا ہے۔ گھر سے متعلق چند اشعار جو مجھے اکثر متاثر کر گئے ملاحظہ فرمائیں۔

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

(افتخار عارف)

گریز پا ہے نیا راستہ کدھر جائیں
چلو کہ لوٹ کے ہم اپنے اپنے گھر جائیں

(جمال اویسی)

جانے کیا کیا بادلوں کے درمیاں سازش ہوئی
جس کا گھر مٹی کا تھا اس کے ہی گھر بارش ہوئی

(نامعلوم)

تم پرندوں سے زیادہ تو نہیں ہو آزاد
شام ہونے کو ہے اب گھر کی طرف لوٹ چلو

(عرفان صدّیقی)

مسز زرینہ بیگم، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، پریاگ راج

پہلے ہر چیز تھی اپنی مگر اب لگتا ہے
اپنے ہی گھر میں کسی دوسرے گھر کے ہم ہیں
(ندافاضلی)

گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں مگر جانے کیوں
شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے
(افتخار عارف)

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے
(شہریار)

در بہ در ٹھوکریں کھائیں تو یہ معلوم ہوا
گھر کسے کہتے ہیں کیا چیز ہے بے گھر ہونا
(سلیم احمد)

مکاں ہے قبر جسے لوگ خود بناتے ہیں
میں اپنے گھر میں ہوں یا میں کسی مزار میں ہوں
(منیر نیازی)

سنا ہے شہر کا نقشہ بدل گیا محفوظؔ
تو چل کے ہم بھی ذرا اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
(احمد محفوظ)

اس کی آنکھوں میں اتر جانے کو جی چاہتا ہے
شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے
(کفیل آزر امروہوی)

ان تمام اشعار میں گھر کے مضمون کی زیادہ تر صورتیں نئی زندگی کے بدلتے

ہوئے ماحول، بدلتے ہوئے عذاب کا احساس کراتی ہیں کہ ہر دور کا شاعر کسی نہ کسی طرح اس موضوع سے متاثر ضرور رہا تبھی تو اس کے کلام میں کہیں نہ کہیں ''گھر'' کا تصور ابھرتا رہا اس پس منظر میں جب ہم غالبؔ کے کلام کا بغور جائزہ لیں تو اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ یقیناً غالبؔ کے فکر وفن کی کائنات بے حد حسین و لافانی ہے۔ جہاں احساس جمال بھی ہے، فلسفیانہ تصورات بھی، شگفتگئ خیال بھی اور رعنائی فکر بھی، درد کی شدت بھی اور احساس زیاں بھی، سیاسی کرب بھی اور سماجی آگہی بھی اور وہ عصری حسیت جوان کے فکر وفن کو اوج ثریا عطا کرتی ہے۔ ان مختلف النوع خصوصیات سے مسجع غالبؔ کی شاعری میں دیکھنا یہ ہے کہ خود غالبؔ کے لئے ''مکان'' یا ''گھر'' کا تصور کتنا اہم تھا لیکن اس سے پہلے ان کی ذاتی زندگی کے ایک رُخ پر طائرانہ نظر ڈالتے چلیں تو اس موضوع کو پرکھنا شاید زیادہ آسان ہوگا۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ ۸/رجب ۱۲۱۲ھ بمطابق ۲۷/دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبداللہ بیگ مختلف درباروں میں مناصب جلیلہ پر فائز رہے آخر عمر میں راجہ بختاور سنگھ والی الور کے ملازم ہوئے غالبؔ پانچ برس کے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا چچا نصراللہ بیگ نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا لیکن ابھی غالبؔ ۸/سال کے ہی تھے کہ چچا کا بھی انتقال ہوگیا انگریز حکومت نے ان کو عطا کی ہوئی جاگیر واپس لے لی اور ورثاء کی پینشن مقرر کردی ۱۸۵۷ء کے بعد پینشن بھی موقوف ہوگئی چچا کے انتقال کے بعد بقول حالیؔ مرزا اپنے نانا کی سرپرستی میں پہونچ گئے جہاں باضابطہ نگرانی نہ ہونے کے سبب قصہ مختصر غالبؔ کی تعلیم وتربیت خاطر خواہ نہ ہوسکی۔ بقول غالبؔ ؎

''ایام دبستاں نشینی میں شرح مانده تک پڑھا بعد اس
کے لہو لعب اور آگے چل کر فسق وفجور اور عیش وطرب

میں مبتلا ہو گیا۔''

اپنے نانا کی جاگیر کے متعلق غالبؔ نے منشی شیو نارائن کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

''ہماری بڑی حویلی جواب لکھی چند سیٹھ نے مول لے لی ہے اس کے دروازوں کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس کی کٹھیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرہ وہ گدریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹرہ کے وہ کشمیریوں والا کہلاتا تھا اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔''

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ کے نانا کے پاس اچھی خاصی حویلیاں اور جاگیر تھی ان کا بچپن اس وقت شاندار حویلی میں گزرا تو بلا شک محلات وحویلیوں نے غالبؔ کی شخصیت پر خاصا اثر ڈالا ہوگا۔

۱۳ برس کی عمر میں غالبؔ کا عقد امراؤ بیگم سے ہو گیا شادی کے بعد غالبؔ دہلی آگئے لیکن یہاں ان کا کوئی ذاتی گھر نہیں تھا وہ ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے ۔بقول حالیؔ:

''دہلی میں قیام کا زمانہ تقریباً (۵۰) پچاس برس کا معلوم ہوتا ہے۔اس تمام مدت میں انھوں نے غالباً کوئی مکان نہیں خریدا ہمیشہ کرائے کے مکانوں میں رہے یا ایک مدت کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرایہ رہے جب

ایک مکان سے جی اکتا جاتا تو دوسرا مکان لے لیتے
مگر قاسم جان گلی اور حبس خان کے پھاٹک یا اس کے
قرب وجوار کے سوا کہیں اور نہیں رہے۔''

مذکورہ بیان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ بات بڑی حیران کُن ہے کہ غالبؔ جیسے نابغہٗ روزگار شخص نے کبھی اپنا ذاتی گھر تعمیر کرنے کا تصور بھی نہیں کیا۔ بقول نثار احمد فاروقی:

''غالبؔ نے ۷۲ سال کی زندگی پائی اور یہ زندگی بڑی
ہموار گزری اس میں کبھی بلند نصب العین کے لئے جد
وجہد یا ہمہ گیری یا ہنگامہ نہیں ہے۔''

شاید زندگی کی اسی ہمواری نے غالبؔ کو ''تعمیر گھر'' یا ''تعمیر مکان'' سے باز رکھا یہاں تک کہ جب وہ کلکتہ سفر پر گئے تو یہاں بھی ایک عمدہ مکان اُن کے مطابق مل گیا۔ اسمٰعیل پانی پتی نے ایک خط میں لکھا ہے کہ

''جس دن غالبؔ کلکتہ پہونچے اسی دن کسی غیر
معمولی جستجو اور زحمت کے بغیر انھیں رہنے کے لئے
بہت معقول مکان مل گیا۔ یہ مکان شملہ بازار گورد
کے تالاب کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں
تھا مکان کھلا پُر فضا تھا اس میں ضروریات کی تمام
چیزیں مہیا تھیں۔۔۔۔۔۔مکان کا کرایا ایک
روایت کے بموجب دس روپے اور ایک دوسری تحریر
کے مطابق چھ روپے ماہوار تھا۔''

اب غور کا مقام یہ ہے کہ غالبؔ جنھیں آلام روزگار نے اگرچہ ہمیشہ اپنے

شکنجے میں گرفتار رکھا اولاد سے محرومی کا غم، مستحکم مالی ذرائع کے نہ ہونے کا غم اور سب سے بڑھ کر اُن کی فنکارانہ صلاحیت کے شایان شان قدر و منزلت نہ ملنے کا غم جیسے منفی عوامل کے باوجود غالبؔ میرؔ کی طرح یاسیت کا شکار نظر نہیں آتے بلکہ ہر مشکل کو سہل بنانے کے لئے کمر بستہ رہے اولاد کی محرومی ہونے پر عارفؔ کے بچوں کی پرورش میں لگ گئے مالی وسائل کے لئے بھی تگ و دو کرتے رہے اور اپنے فن کے سلسلہ میں بھی بڑے مثبت رویّے سے کام لیتے ہوئے کہہ گئے ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اتنی پریشانیوں کے باوجود حیرت ہوتی ہے کہ غالبؔ کے کلام میں گھر کا تصور گھر نہیں بلکہ ہمیشہ دشت و بیاباں کے شکل میں ابھرتا ہے۔ ویسے تو ہر شاعر کا اپنا خصوصی ذہنی رجحان ہوتا ہے جو اس کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے جیسے میرؔ کی شاعری کا محور دل اور دلّی کا مرثیہ کیونکہ میرؔ کی خانہ ویرانی نے انھیں ایسے اشعار کہنے پر مجبور کیا، میرؔ جس طرح کے مکانات میں رہے اتنی صعوبتوں سے گزرے لیکن غالبؔ جس نے ہمیشہ اچھے وسیع اور خوبصورت حویلیوں میں زندگی بسر کی تھی ان کی شاعری میں گھر کے متعلق دشت و بیاباں کا تکرار ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ خانہ ویرانی قصر اور بیاباں کے تقابل کے چند اشعار پر غور فرمائیں:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

☆☆☆

نقصاں نہیں جنوں سے بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں بُرا نہیں

☆☆☆

اُگ رہا ہے در و دیوار پر سبزہ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

☆☆☆

کم نہیں دن بھی خرابی میں یہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد آیا

☆☆☆

گریہ چاہے ہے خرابی مِرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

ان اشعار میں کہیں نہ کہیں ایک قسم کا طنز پوشیدہ ہے جو پورے نظام پر سوال اٹھاتا ہے کہ بے یقین زندگی کا کتنا بڑا مسئلہ ہے یہ بھی دکھائی دیتا ہے یعنی زندگی کی مثبت قدریں، سماجی رشتوں میں گفت وشنود، ہمدردی وانکساری کا نہ پایا جانا کسی ذی شعور حساس انسان کے لئے کتنا اہم ہوتا ہے یہی صفت کسی مکان کو ''گھر'' کہلانے کا مستحق بناتی ہیں اور اگر یہی مفقود ہو جائے تو گھر گھر نہیں قبرستان بن جاتا ہے جسے شاعر دشت وبیاباں سے تعبیر کرتا ہے۔

اسی طرح غالبؔ کا ایک اور شعر ملاحظہ کریں۔

ہر ایک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

اس شعر میں مکان سے مراد اینٹ گارے سے بنا مکان نہیں بلکہ رہنے کی جگہ ہے اور رہنے کی جگہ کو فخر اس کے رہنے والوں سے حاصل ہوتا ہے، رہنے والوں کی پاکیزہ قدروں، محبت وخلوص سے قائم ہوتا ہے۔ مجنوں اپنی مذکورہ خوبیوں کی بنا پر جنگل کو بھی اداس کر گیا۔ ایسا وسیع مضمون، ایسی بلیغ اشاریت یقیناً غالبؔ جیسا

شاعر ہی دے سکتا ہے۔

ان اشعار کی روشنی میں غالبؔ ''حیوان ظریف'' نہیں بلکہ ایک ایسا انسان نظر آتا ہے جو بھرے انبوہ میں بھی تنہا ہے۔ بقول غالبؔ:

''میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں
جانتا آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتا ہے۔ اگر اس ہجوم
غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آ گیا تو کیا عجب ہے
بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غم
مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت کیا نہیں ہے۔''

اور یہ سب غالبؔ کے اشعار کا حصّہ ہیں مگر اس ویرانی میں بھی غالبؔ کے تزک واحتشام میں فرق نہیں آتا اور وہ کہتے ہیں ؂

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدارت کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

☆☆☆

دل میں ذوق وصل و یاد یار بھی باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

ویران گھر اور دربان! ایسا طرفہ تماشا صرف غالبؔ جیسا ظریف اور حس لطیف رکھنے والا ہی سوچ سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر گھر کی ویرانی کا بیان کیا ہو سکتا ہے دوسری جگہ اسی خیال کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؂

ہوا یوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

اس شعر کا گھر بھی غالبؔ کا اپنا گھر ہی تھا تو پھر یہ حسرت تعمیر کیا تھی کیا کسی

شاعر کے لاشعور میں کہیں اپنا گھر اپنا ذاتی مکان تعمیر نہ کر سکنے کی کسک باقی تھی شاید اسی لئے غالبؔ یہ کہہ اٹھے ؎

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے ایک حسرت تعمیر سو ہے

☆☆☆

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

☆☆☆

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اپنی کم مائیگی، حسرت تعمیر جیسی تمام کیفیات کا اس سے بہتر بیان کیا ہو سکتا ہے جو غالبؔ نے کیا یہاں غالبؔ کسی حویلی کے مکین نہیں بلکہ ایک بہت معمولی، افلاس زدہ انسان نظر آتے ہیں جن کو اب خواب میں بھی گھر میسر نہیں سوائے حسرت تعمیر لیکن غالبؔ کی جدت طرازی اُن کے گھر کی تعمیر میں بھی نیا رنگ بھر دیتی ہے۔ دیکھیئے ؎

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے
کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

یہ خلائی گھر کیسے گھر کہا جا سکتا ہے جس کی آگاہی صرف غالبؔ کو ہی اپنے حالات کے پیش نظر رہی ہوگی اپنی نامرادی، محرومی و نارسائی کے احساسات نے غالبؔ کو یہ شعر بھی کہنے پر مجبور کیا کہ ؎

نظر میں کھٹکے ہے سن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

اور کہیں کاتب تقدیر سے اس طرح شکوہ کناں ہوگئے۔

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے

اور اس غم خانے نے اُن کو یہ شعر بھی کہنے پر مجبور کیا۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

ایسے خانماں برباد، بے گھر شاعر غالبؔ اس عالم میں بھی محبوب سے شوخی و ظرافت کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور کہہ اٹھتے ہیں۔

وعدہ آنے کا وفا کیجیے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

کیا غالبؔ جیسے انا پرست شاعر کے لئے ممکن تھا کہ وہ اپنے گھر کی دربانی محض اس لئے کرے کہ محبوب نے آنے کا وعدہ کیا ہے؟ لیکن یہ بھی غالبؔ کا منفرد انداز بیان ہے۔

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے کا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

بہر حال جہاں تک غالبؔ کے گھر یا مکان کا تعلق ہے مذکورہ کلام کی روشنی میں ہمیں کہیں ایک خوش حال یا خوش باش گھر کا تصور تکمیل پاتا نہیں نظر آتا گرچہ غالبؔ نے اپنی جملہ محرومیوں کے ساتھ بڑی خوددار، طرح دار زندگی بسر کی لیکن ان کا صحت مند نظریۂ زندگی اُن کے تصور مکان یا تعمیر گھر کے آگے حوصلہ شکن نظر آتا ہے یہاں غالبؔ

ایک عام انسان کی طرح منتشر دکھائی دیتے ہیں اور ایسے انسان سے اس کے ذاتی گھر کی تعمیر کی توقع شاید مناسب بھی نہیں معلوم ہوتی کیونکہ فسق و فجور اور لہو لعب میں مبتلا غالبؔ کو اپنی کمزوریوں سے بھی آشنائی تھی انھوں نے جس گھر میں آخری ایام گزارے وہ حکیم محمود خاں کے دیوان کے متصل مسجد کے عقب میں تھا وہ جاتے جاتے یہ بھی کہہ گئے۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

غالبؔ جو اپنے انداز بیاں میں تمام سخنوران میں اپنی مثال آپ تھے یہ اور بات کہ ان کی زندگی میں انھیں وہ عزت وعظمت، وہ رفعت و بلندی حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے اور افسوس کہ کبھی اپنے ''گھر کا تصور'' نہ رکھنے والے شاعر کو تاحیات ذاتی گھر نہ نصیب ہوا بعد از مرگ سو سال غالبؔ کے پرستاروں نے انھیں آخر صاحب گھر بنا دیا جب اعلیٰ سطح پر صد سالہ جشن منایا گیا اور بستی نظام الدین دہلی میں غالبؔ کے مقبرے پر خوبصورت عمارت تعمیر کی گئی ساتھ ہی غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کا بھی قیام ہوا اور آخری ایام گزارے ہوئے غالبؔ کے مکان کو قدردانوں نے حاصل کر لیا جو جو شائقین غالبؔ کے لئے یقیناً لمحۂ نشاط ہے۔

غالبؔ کی فارسی مثنوی ’’سرمۂ بینش‘‘

غالبؔ نے فارسی میں بہت کچھ لکھا اور اپنی فارسی نگارشات پر وہ فخر بھی کرتے رہے لیکن ان کے قصیدوں، فارسی غزلوں اور قطعات کے مقابلے میں ان کی فارسی مثنویات کی تعداد بہت کم ہے جو مثنویاں یادگار ہیں وہ بھی روایتی مثنویوں سے بہت زیادہ جدا کہی جاسکتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ مثنوی ’’سرمۂ بینش‘‘ جو بہادر شاہ ظفر کو خراج عقیدت کے طور پر لکھی گئی جن کا تعلق تصوف سے تھا۔ بادشاہ کو تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ تصوف دراصل ایک زاویۂ نگاہ ہے جس کو اپنانے کے بعد انسان کے خیالات، معتقدات، جذبات میں ہمہ گیر انقلاب آجاتا ہے۔ خیر و شر، حسن و قبح، حق و باطل، سود و زیاں سب کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ اس کے لئے جنوں خرد کا اور خرد جنوں کا حکم رکھنے لگتی ہے، درست ہے کہ دنیا کی ہر قوم کی فکری زندگی میں کبھی نہ کبھی تصوف کی کارفرمائی نظر آتی ہے مگر ہم سردست اسلامی تصوف سے بحث کر رہے ہیں۔ یوں تو تصوف کی تعریف ہر ایک نے اپنے ذوق کے مطابق کی ہے مگر جنیدؒ کی تعریف زیادہ دل نشیں اور جامع ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تصوف فصیح خیال کا نام ہے۔ ایک صوفی بھی چلنے پھرنے، رہنے سہنے، کھانے پینے میں عام انسانوں سے مشابہ ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس کا اندازِ فکر اور طریق تعبیر سب جدا ہوتا ہے۔ صوفیاء کا بنیادی عقیدہ ماسوا کی نفی ہے یعنی صرف ذات حق موجود ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ وجودی ہوں یا شہودی دونوں کو اس سے چارہ نہیں۔ فرق یہ ہے کہ وجودی یا وحدۃ الوجود کے ماننے والے کائنات کے لئے وجود ظلّی بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے برخلاف شہودی یا وحدۃ الوجود الشہود کے معتقد کائنات کا وجود ظلّی تسلیم کرتے ہیں مگر اس کا وجود حقیقی ان میں کوئی مانتا۔ وجودی اور شہودی کا فرق سمجھنے کے لئے ایک مثال پیش نظر ہے کہ وجودی کی نظر میں آفتاب

ڈاکٹر شبانہ عزیز، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، پریاگ راج

روشن ہے اور چاند جو اس سے نور مستعار لیتا ہے تاریک ہے لیکن شہودی چاند کی ظاہری ہیئت کی بنا پر اس کو روشن کہہ سکتا ہے۔ اگرچہ اس کی روشنی آفتاب کے سامنے ٹھہرنے والی نہیں۔ جمہور السنّت صوفیاء کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور تصوف کو عین اسلام کہتے ہیں۔ اس کے باوجود فارسی اور اردو کے متعدد شعراء عقیدتاً تصوف سے بیزار ہوتے ہوئے بھی شعر میں تصوف کے باریک اسرار و رموز کو پھیلانے میں آگے آگے نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ۔

در تصوف می شود شیریں کلام

لیکن غالبؔ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''توحید وجودی ان کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی انہوں نے عبادات اور فرائض وواجبات میں صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسری نبی اور اہل بیتِ نبی کی محبت اور اسی کو وہ وسیلہ نجات سمجھتے تھے۔ خود غالبؔ کی فارسی اور اردو کلام نثر و نظم سے تائید ہوتی ہے۔

''سرمۂ بینش'' غالبؔ کی ایک مختصر مثنوی ہے جو نہایت اہم ہے۔ اہم اس اعتبار سے کہ اس مثنوی میں انہوں نے اپنے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو ''سرمۂ بینش'' کے ذریعہ خراج تحسین وعقیدت پیش کیا ہے اور ایک خاص زاویۂ نگاہ سے اس آخری تاجدار دہلی کے صوفیانہ خیالات اور درویشانہ مزاج کی تعریف وتعبیر کو اپنا موضوع بنایا کیونکہ بہادر شاہ ظفر حضرت مولانا فخر الدین کے خاندان میں مرید تھے اور یہاں کالے صاحب سے جو اپنے وقت کے ایک پیرزادے تھے انہوں نے بیعت کی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے لئے کہا جاتا ہے کہ تصوف سے ان کو گہرا لگاؤ تھا اور ان کی اردو شاعری میں ایسے اشعار کی تعداد نسبتاً کم ہے جس میں تصوف کے مضامین آئے ہوں۔

غالبؔ کو تصوف کے مطالعہ سے دلچسپی تھی۔ ان کے فارسی خطوط میں اس

طرح کے حوالے آتے رہتے ہیں، جو تصوف سے ان کی دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر لکھتے ہیں۔

''حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا'' اسے بے خبر ز لذت شرب مدام ما، دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں درپیے کے بقیوں اور لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور بات ہے اور عرفاء کے کلام سے حقیقت قصّہ وحدت وجود کو اپنے دلنشیں کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موجد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہٰ الا اللہ کہتا ہوں، دل میں لاموجود الا اللہ۔ لاموثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔''

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''زہے خامیٔ عامہ مومنیں کہ وہ اس کلام (لا الہٰ الا اللہ)
سے صرف نفی شرک فی العبادت مراد لیتے ہیں''

اور نفی شرک فی الوجود اصل مقصود ہے۔ وہ ان کی نظر میں نہیں۔ اس طرح کی نا جانے کتنی مثالیں موجود ہیں۔ غرض مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں۔

غالبؔ کی کلیات کی پہلی مثنوی ''سرمۂ بینش'' ہے جس میں وہ بہادر شاہ ظفر کے حوالے سے صوفیانہ انداز نظر پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس معنی میں ایک عجیب و غریب شعری تخلیق ہے کیونکہ ایک ہی وقت میں اپنے لحاظ سے ایک مثنوی اور اپنے طریقۂ رسائی کے اعتبار سے ایک قصیدہ ہے لیکن کسی بادشاہ کی زبان سے مسائل تصوف کا بیان اور وہ بھی کافی شرح و بسط کے ساتھ۔ اس کی شاید ہی کوئی مثال اردو یا فارسی میں

دستیاب ہو سکے۔

جہاں تک مثنوی کے نام کا تعلق ہے اس میں کوئی خاص ندرت نہیں بلکہ اس نام سے تو کسی کتاب فصائح کا تصور اُبھرتا ہے۔

مثنوی ''سرمۂ بینش'' مثنوی مولانا روم کی مشہور مثنوی کی بحر میں ہے۔ مولانا روم کی مثنوی کا پہلا شعر

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وزجدائی ہا شکایت می کند

تائیداً نہیں بلکہ تعریفاً آتا ہے۔ اس کے بعد چند شعر بھی مولانا روم کے اس اولین شعر کی تشریح کے طور پر آتے ہیں اور اس شعر کے تاثر وتصور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ غالبؔ نے شاید اس لئے پسند کیا کہ اس نظم کا مختص صوفیانہ پس منظر مولانا کے شعر اور اس شعری اظہار سے پیش کیا جائے جو اس شعر کے ساتھ غالبؔ کے ذہن پر کچھ وقت کے لئے طاری رہا۔ یہ شعر تمہید کے طور پر لکھنے کے بعد غالبؔ نے گریز کا جو انداز اپنایا اس کا اظہار ان اشعار سے ہوتا ہے

ای کہ از رازِ نہاں آ کہ نہ
دم مزن ازرہ کہ مرد رہ نہ
دست، در دامانِ مرد راہ زن
ایک رہبر راشناس از راہ زن
در ہزاراں مرد، مرد رہ یکیست
آدمی بسیار، امّا شہ یکیست

ترجمہ۔ اے مخاطب اگر تو راز نیاز سے واقف نہیں ہے تو طریقت کا دم نہ بھر کیونکہ تو مرد طریقت نہیں ہے۔

کسی مردِ حق کا دامن پکڑ لے لیکن ضرورت ہے کہ رہبر اور راہ زن میں امتیاز نہ کرے۔

ہزاروں انسانوں میں مردِ حق کوئی ایک ہی نکلتا ہے۔ آدمی تو بہت ہیں لیکن بادشاہ ایک ہی ہوتا ہے۔

ان اشعار میں غالبؔ نے بادشاہ کا ذکر کر کے دراصل ذہن کو بہادر شاہ ظفر کی طرف مبذول کیا ہے کہ بادشاہ کا ذکر خیر ہی مقصد بھی ہے۔ یہ اشعار متصوفانہ مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں اور شاہی دربار کی فضا کو خانقاہی طرزِ فکر سے قریب تر لے آتے ہیں جس کا اندازہ ان اشعار کے ترجمہ سے کیا جا سکتا ہے۔

غالبؔ کے طریقۂ رسائی کو سمجھنے کے لئے جہاں پر بادشاہ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

مردِ رہ باید کہ باشد مردِ عشق
لب ترنم خیزد در دل، درد عشق

ترجمہ۔ مردِ راہ کو چاہئے کہ وہ مردِ عشق ہو۔ اس کے لبوں پر ترنم ہو اور اس کے دل میں عشق کا درد پنہاں ہو۔

در طریقت رہنمائے رہرواں
در خلافت پیشوائے خسرواں

وہ طریقت میں اہل دل کا رہنما ہے اور خلافت میں بادشاہوں کا بادشاہ۔

یہاں لفظ خلافت، سلطنت کے معنی میں آیا ہے کہ مسلمانوں نے تاریخ اسلامی کے ابتدائی دور کی کئی صدیاں بادشاہوں کو ''خلیفہ'' کہہ کر گزاریں یہاں بھی غالبؔ نے خلافت سے یہی مراد لی ہے لیکن لفظ طریقت کے مقابلے میں خلافت بمعنی بادشاہت اپنی موزونیت کا اظہار نہیں کرتا۔

آں کہ چوں بر آسماں تار آیدش
تخت جوں رفرف پرواز آیدش

جب اس کا شوقِ سفر اسے آسماں کو تیز پروازی کے ساتھ طے کرنے کی طرف لاتا ہے۔اس کا تخت رف رف کی طرح پرواز اختیار کر لیتا ہے۔

ان مصرعوں سے بیک وقت ان دو پیغمبروں کا خیال آتا ہے جن کی زندگی کے معجزوں کو ظاہر کرتا ہے۔ایک حضرت سلیمانؑ کا ہواؤں پر حکومت کرنا اوران کے قالین کا ہوا پر اڑنا دوسرے براق،حضوراکرم رسول مقبولؐ کے واقعۂ معراج سے جس سواری کا رشتہ ہے،جس کو''رف رف'' کا نام دیا گیا۔جس کا مطلب یہ ہوا کہ غالبؔ نے بادشاہ کی زندگی میں دو پیغمبروں کے سفر آسمانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس شعر میں تلمیح کی موجودگی نے شعر کی فضا میں تقدیس کا عنصر داخل کر دیا ہے۔ یہاں صوفیانہ کمالات کا مظہر قرار دیا گیا ہے۔بادشاہ ظفر کے لئے جو بھی سرمایۂ ثناءو ستائش اردو فارسی میں ہیں اس میں یہ مثنوی ایک خاص امتیاز رکھتی ہے اورادبی حسن میں یک گونہ اضافہ صورت ہوتا ہے۔بادشاہ کے وہ ابیات اور خیالات پیش کئے ہیں،جن کے اظہار میں ایک طرح کی فلسفیانہ رمزیت ہے۔

غالبؔ نے وحدۃ الوجود کے بارے میں بہادر شاہ ظفر کا بیان کیا۔ایک عارفانہ نکتۂ تمثیل کی شکل میں نقل کیا ہے اور بعد میں اس کی تشریح کی ہے۔آخری کے اشعار میں لکھتے ہیں؎

غالبؔ از رازے کہ گفتنی دم زن
سنگ بر پیمانہ عالم مزن

غالبؔ اس راز کے اظہار سے خاموش ہو اور اہل دنیا کے پیمانے پر پتھر مت مار۔

راز وحدت برنشاید بد گفتگو
حرف حق را درنیاید بد گفتگو

رازِ وحدت بیان سے باہر ہے اور خدا کی باتیں گفتگو سے پرے۔

بر دعائے شہ سخن کوتاہ باد
تا خدا باشد بہادر شاہ باد

بادشاہ کی دعا پر کلام کو ختم کر اور عرض کر کہ جب تک خدا رہے بہادر شاہ رہے۔

شعروں میں ظاہری طور پر مبالغہ نظر آتا ہے جو بے مزہ ہے اور راز کا رخوشامد کو ظاہر کرتا ہے ایسا معلوم پڑتا ہے لیکن یہاں شاعر کی نظر میں اس کی توجیہہ یوں ہے کہ حقیقی وجود صرف حق تعالیٰ کا ہے جو ہمیشہ سے ہے اور رہے گا۔ جس کا وجود رہتی دنیا میں ہمیشہ قائم ودائم رہے گا۔ عارف جب اس سے جاملا تو یوں سمجھئے کہ ''فنا فی اللہ'' ہوکر ''بقا باللہ'' کی منزل کو طے کرلیا۔

نسبت کس بعد از خدا غیر از خدا
ایں بود سرِ بقا بعد از فنا

خدا کے بعد خدا کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ فنا کے بعد بقا کا یہی راز ہے۔ خدا کے بعد خدا کے ماسواء اور کوئی بھی نہیں ہے اور یہی احساس فنائے غیر ہے، جو بقاء کا راز ہے۔ وحدت کا راز تو وہ ہے کہ اس پر گفتگو بھی نہیں کی جاسکتی۔ سچ یہ ہے کہ حرف حق کو گفتگو میں شامل ہی نہیں کیا جاسکتا۔

غالبؔ کے صوفیانہ خیالات کی رمز شناسی میں ان اشعار کے ذریعہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ جگہ جگہ مجاز و حقیقت کی گفتگو میں اپنے صوفیانہ عقائد ونظریات کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں۔ غالبؔ کے نقطۂ نظر کی پوری وضاحت پیش کرنے کے لئے چند شعر ترجمہ کے ساتھ پیش ہے۔

من نیم کز خود حکایت می کنم
زدم مردے روایت می کنم

میں ایسا نہیں ہوں کہ اپنے بارے میں کوئی حکایت بیان کروں، بلکہ میں ایک مرد خدا کی زبانی یہ روایت پیش کرتا ہوں۔

از دم فیضے کز استاد آدرم
خامہ را جوں نے بفریاد آدرم

اس فیض کی بدولت جو مجھے استاد سے پہونچا ہے قلم کو نے کی مانند فریاد پر آمادہ کرر ہا ہوں۔

بر نوائے راز حق گر دل نہی
تامدت جوں نے خود بودہ نہی

راز الٰہی کے نغمے پر اگر تم دل لگاؤ تو تم بانسری کی طرح اپنی ہستی کو خالی کر دو۔

گر نۂ دل ریش از مستے ملاف
کیں سے از تندے بود پہلو شگاف

اگر تمھارا دل چوٹ کھایا ہوا نہیں ہے تو مستیِ محبت کا دعویٰ نہ کرو کیونکہ یہ شراب یعنی محبت اس قدر تیز ہوتی ہے کہ پسلیاں توڑ دیتی ہے۔

گفت کا نذر معرض اسرار دوست
ہر کہ باشد طالب دبدار دوست

اس نے فرمایا کہ جو کوئی دوست کے دیدار کا طالب ہو۔

خواہد از نور جمال باد خویش
روکش مشرق در و دیوار خویش

اور وہ چاہے کہ اس کے نور جمال سے اپنے در و دیوار کو منور کرے۔

برگ گل در رہ فستاند مشت مشت
تا نیا بد خاک زیر پا درشت

پھر راہ میں مٹھی مٹھی بھر بھر کر پھولوں کی پنکھڑیاں بکھیرے تا کہ پاؤں تلے زمیں سخت نہ معلوم ہو۔

مدعا تہذیب اخلافت و بس
سعی در تحصیل اشرافت و بس

اس کا مقصد تہذیب اخلاق اور اس کی غرض تحصیل اشراق ہے اور کچھ نہیں۔

رفتن عاشق باستقبال دوست
مطلب از محبوبت آثار اوست

عاشق کا دوست کی پذیرائی کے لئے اپنی ہستی سے گزرنا یہ ہے کہ وہ وجود اور آثارِ وجود سب کو مٹا دے۔

آں کہ چوں از راز وحدت دم زند
دفتر کون و مکان برہم زند

جب وہ راز وحدت زبان پر لاتا ہے تو کون ومکاں کے دفتر درہم برہم کر دیتا ہے۔

آں کہ چوں شوق آسماں تاز ایدش
تخت چوں رف رف پرواز ایدش

جب اس کا شوق آسمان اس کار فرما ہوتا ہے تو اس کا تخت رف رف کی طرح پرواز کرنے لگتا ہے

شاہ ما دارد بہم در رہ روی
خرقہ پیرے و تاج خسروی

ہمارا بادشاہ سلوک میں خرقہ درویشی اورتاجِ خسروی دونوں کا مالک ہے۔

مختصراً ہزاروں لوگوں میں مردراہ تو ایک ہی ہوتا ہے۔ جیسے ہما شما تو بازار میں بے شمار ہیں، مگر بادشاہ تو ایک ہی ہے۔ یہاں بادشاہ کا لفظ ایک علامت ہے؛ امتیاز عظمت اور خیر کی علامت، اگرچہ بادی النظر میں وہ ایک عام بات معلوم ہوتی ہے۔ تمہیدی افکار کے طور پر غالبؔ نے ایسی کچھ روایتی دلیلوں کو پیش کیا ہے جو صوفی ادب میں بھی کسی نہ کسی حوالے میں مل جاتی ہے۔ جیسے جب کوئی اپنے معشوق کو بلاتا ہے دعوت کے لئے کہ وہ آئے اور اس کے گھر کو اپنی آمد سے رونق بخشے تو وہ اپنے گھر کے درودیوار و بام کی صاف صفائی کرتا ہے۔ گھر اور آنگن کو جھاڑ و فانوس سے سجاتا ہے۔ عطر و گلاب کا چھڑکاؤ کرتا ہے۔ پھول و پتّے سے آرائش کرتا ہے۔ یہ صوفیانہ انداز نظر ایک روایتی طرز اظہار اور انداز گفتگو میں آتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ اس طرح کے اشعار بادشاہ نے اپنے کلام میں پیش کیا ہو۔ انھیں اشعار کی وجہ سے سرمۂ بینش کے ادبی حسن میں یک گونا اضافہ بہر صورت ہوتا ہے۔ بادشاہ کے وہ ابیات و خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں جن کے اظہار میں ایک طرح کی فلسفیانہ رمزیت ہے۔

جوں در آید آں نگار از خود رود
خوش باستقبال یار از خود رود

جب محبوب قدم فرمائے تو اس عاشق کو چاہیئے کہ استقبال کی خوشی کے غرض سے اپنی خودی سے گزرجائے۔

عاشق از خود رفت دلبر ماند و بس
سایۂ گم شد مہرا نور ماند و بس

جب عاشق کی خودی جاتی رہی تو صرف معشوق رہ گیا۔ سایہ گم ہوا اور

آفتاب باقی رہا۔

حملہ جانا ماند و جسم و جاناں نماند

حسرت وصل و غمِ ہجراں نماند

جسم و جاں ختم ہو گئے اور جاناں کے سوا کچھ نہ رہا، نہ وصل کی خوشی رہی نہ ہجر کا غم۔ یعنی جب وہ نگارِ شیریں ادا آجاتا ہے تو عاشق اس کی آمد کی نوید کی خوشی میں از خود رفتہ ہو جاتا ہے۔ عاشق کا اپنا وجود درمیان سے غائب ہو جاتا ہے اور صرف محبوب رہ جاتا ہے اور بس، سایہ گم ہو جاتا ہے اور مہر انور باقی رہ جاتا ہے۔ اب صرف محبوب تصور محبوب اور تصویر محبوب ہی باقی رہ جاتی ہے۔ جسم و جاں کا احساس باقی نہیں رہ جاتا۔ یہاں تک کہ حسرت وصل اور غم ہجراں بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی مثنوی سرمۂ بینش میں ان کے نقطۂ نظر کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

غالب اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہے اور ان کا امتیاز یہ ہے کہ ان کی شاعرانہ بصیرت مستقبل سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ فرسودہ نظام اور سماج کی جگہ لینے والے نئے نظام زندگی کی آہٹ محسوس کر کے وہ آنے والے عہد میں رو بہ عمل ہونے والے نظام اور سماج کی تشکیل جدید میں لگ جاتے ہیں اور لوگوں کو اس کی بشارت دیتے ہیں۔ ان کی شوخیانہ سنجیدگی ان کی شاعری میں کچھ انوکھے اور اندیکھے رنگ بھر دیتی ہے۔ غالب اپنے عہد میں اسی لیے منفرد اور تنہا نظر آتے ہیں۔ غالب کی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں۔ ہر جہت مختلف الجہات ہے۔ ان کی شخصیت علم و فن کا وہ بحر بیکراں ہے جس میں فکر و شعور کی بے شمار لہریں موجزن نظر آتی ہیں۔ ان کی شخصیت کسی ساحر کی مانند مسحور کر دیتی ہے۔ ان کے اس سحر کا سہی اندازہ ان کے فن کی گہرائی اور اس گہرائی میں پوشیدہ بے بہا فکری خزانے سے ہوتا ہے جس کی سمندر کی گہرائی کی طرح کوئی اتھاہ نہیں۔ غالب کی شاعری پڑھ کر ان کی غیر معمولی بصیرت سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور وہ سبک روی سے بصد ناز و انداز ذہن کے افق پر ظاہر ہونے لگتی ہے۔ ان کا کلام پڑھ کر شاعر کی قوت الہام پر یقین پختہ ہو جاتا ہے۔ غالب کے اشعار ہوں، مصرعے ہوں، ان میں مستعمل لفظی پیکر ہوں یا ان کے ملفوظات، نثری پیکر لفظی اور ظریفانہ فقرے ہوں، انسانی فکر اور انسانی زندگی کے گہرے رموز و اوقاف کے حامل ہیں۔ کسی غیر معمولی شعور و آگہی کا عرفان بخشتے ہیں۔ غالب کی شعری عظمت، شعری ندرت اور ظرافت ان کی شخصیت کی جامع تعریف کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ خصوصیات غالب کے فن کے نمایاں پہلو ضرور ہیں تاہم یہ ان کی شخصیت کی مکمل تعبیر اور توضیح سے قاصر ہیں۔ غالب کے یہاں

ڈاکٹر محمد شاہد، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مربوط فلسفہ اور منظّم فکری نظام نہ ہونے کے باوجود فکروفلسفہ کی غیر معمولی بصیرت آمیز سطحیں مل جاتیں ہیں۔ غالب ایک دانشور، مفکر اور مختلف علوم وفنون پر دسترس رکھنے والا ایسا فنکار ہے جو خود کو ایک عام انسان ہی سمجھتا رہا۔ وہ خود کو خاص نہیں سمجھتا یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ خواص کے بجائے عوام کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔ وہ مئے خواروں کے ساتھ ان کے جیسا نظر آتا ہے۔ اہل علم کے درمیان علم ودانش کے موتی بکھیرتا ہے۔ جب وہ شاعری کرتا ہے تو انسانی زندگی اور کائنات کے اسرار کا راز داں بن جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود غالب ایک پہیلی ہے۔ ایک راز سربستہ کی مانند جسے حل کرنے کی کوشش میں جو جتنا آگے بڑھتا ہے وہ اور زیادہ گہرائی میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ نئی جہتیں کھلتی ہیں اور نئے باب واہوتے چلے جاتے ہیں۔

برصغیر ہند و پاک میں غالب کی شناخت اگر چہ ان کے اردو کلام کی بدولت ہے لیکن وہ خود اپنے فارسی کلام کو اولیت کا درجہ دیتے تھے اور اس کے مقابلے اردو کلام کو کمتر سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے اپنے اردو کلام کے بارے میں کہا تھا کہ ''بگزار مجموعۂ اردو کے بے رنگ من است''۔ غالب کے اس بیان سے متعلق ایسی آرا بھی نظروں اور سماعتوں سے گزری ہیں کہ غالب نے اپنی فارسی زبان دانی کا اظہار بطور علو شان کیا ہے۔ غالب پر یہ الزام عائد کرنا کہ وہ یہ مذکورہ بیان دے کر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بہت بڑے فارسی داں ہیں یا اردو شاعری کو ہیچ سمجھتے ہیں، بالکل بے جا اور غیر مناسب ہے۔ اس کی مختلف وجوہ ہیں۔ اول تو یہ کہ غالب کی فارسی زبان وادب پر غیر معمولی دسترس اہل علم وفن کے درمیان تسلیم شدہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ غالب کی شخصیت ایسی پراسرار اور تہہ دار ہے کہ ان کے بارے میں جلد رائے قائم کرنا حقیقت سے بعید تر کر دیتا ہے۔ غالب کا عام بول چال بھی تہہ داری اور معنوی گہرائی سے خالی نہیں ہے۔ اس حوالے سے ایک اور اہم بات یہ کہ غالب کے مذکورہ بیان کی تردید یا

اس کی تفہیم سے قبل ان کے فارسی اور اردو کلام کا تقابلی مطالعہ کرنا بھی بے حد ضروری ہے۔ اگر غالب کے اردو کلام کو ان کے فارسی کلام کے ہم پلہ رکھ کر نہیں دیکھا جائے گا تو کس طرح ان پر اعتراض کرنے والے اپنی دلیل پیش کر پائیں گے؟ اس لیے اس طرح کے اعتراضات قابل اعتبار نہ ہو کر بعید از قیاس اور تھوپے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بات بعید از قیاس بھی معلوم ہوتی ہے کہ غالب چیختے چلاتے رہے......اور کہتے رہے کہ میرا فارسی کلام دیکھ لو...... پڑھ لو اور سمجھ لو۔ اس میں تمہیں مختلف رنگ اور مختلف خوشبوئیں ملیں گی:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزار مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

لیکن ہم نے ان کی ایک نہ سنی۔ اوپر سے ان پر یہ الزام عاید کر دیا کہ وہ اپنی فارسی دانی کا اظہار بطور علو شان کرتے ہیں۔

غالب نے اردو سے زیادہ فارسی میں شاعری کی ہے۔ انہیں اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ ان کی اردو شاعری بھی مشکل فارسی ترکیبوں اور خالص فارسی لفظیات سے بھرپور ہے۔ تلمیحات، علامات اور تہذیبی قدروں کا پس منظر بڑی حد تک فارسی تہذیبی اور جغرافیائی حدود پر مشتمل ہے۔ غالب کے بعض اشعار مشکل فارسی الفاظ، کثرت اضافات، فارسی تراکیب اور ایرانی الاصل تلمیحات بھرپور ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کے چند اردو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

☆☆☆

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

☆☆☆

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

☆☆☆

قطعِ سفرِ ہستی و آرام فنا، ہیچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزش پا، ہیچ

مذکورہ اشعار غالب کی اردو غزلوں سے ماخوذ ہیں لیکن ان میں حروف عاطفہ اورحروف اضافت وغیرہ کے علاوہ بیشتر الفاظ فارسی الاصل ہیں اور فارسی کی مشکل ترکیبیں اوراضافتیں ہیں۔ان میں کافی پیچیدگی ہے۔یہ بات بھی مسلم ہے کہ ابتدامیں غالب نے کس طرح دقیق اورعمیق طرز اظہاراپنایا تھا۔غالب کے کلام کا ایک حصہ سادگی پر مبنی ہے لیکن بیشتر حصہ مشکل، غیر مانوس فارسی تراکیب اورتشبیہات و استعارات سے مملو ہے۔غالب اپنی مشکل پسندی پر نازاں بھی رہے۔خودانہیں کے لفظوں میں:

سخن سادہ دلم رانفریبد غالب
نکتۂ چندز پیچیدہ بیانی بہ من آر

اردو زبان میں باقاعدہ طور پر شاعری کے ارتقا کے لیے اٹھارویں صدی عیسوی میں اس وقت راہیں ہموار ہوئیں جب ولی دکنی اوران کے دیوان نے شمالی ہند کے شعراکواس زبان میں شاعری کی ترغیب دلائی۔غالب سے دونسل پہلے کے شعرانے جس زبان ریختی کو پہلی بار منہ لگانا گوارا کیا تھاوہ اتنی جلدی اس قدراہمیت اختیار کرگئی

کہ غالب تک آتے آتے اس نے فارسی زبان کے شعروادب کو دوسرے درجے کا زبان وادب بنا دیا۔ ہندوستان میں فارسی زبان کا انحطاط غالب کے دور میں ہی شروع ہو چکا تھا۔غالب نے جس دور میں شاعری کی اس دور میں فارسی اردو کے مقابلے ثانویت اختیار کرگئی تھی اور آنے والے وقت میں فارسی جاننے والے کم سے کم ہوتے گئے اور پھر شاذونادر ہی رہ گئے۔مغلوں کے بعد فارسی کا سرکاری درجہ تو ختم ہو ہی چکا تھا، انگریزوں کے جدید نظام تعلیم نے فارسی کو تعلیمی سطح پر بھی زک پہنچائی اور اس کی تعلیمی حیثیت بھی مجروح ہوگئی جس کا اثر یہ ہوا کہ عوام سے اس کا رشتہ تقریباً منقطع ہو گیا۔سلطنت دہلی کے زوال کے ساتھ فارسی بھی زوال آمادہ ہوگئی۔قطب الدین ایبک سے لیکر بہادر شاہ ظفر تک یہ زبان کاروبار مملکت اور دربار کی زبان رہی۔

نوآبادیاتی عہد میں انگریزی طرز تعلیم کو فروغ دیا گیا۔انگریزوں نے اپنی سیاسی بنیاد مضبوط کرنے کی غرض سے اپنا طرز تعلیم، اپنی تہذیب اور اپنی زبان کو رائج دینے کی پرزور کوشش کی۔ ہندوستانیوں کے پاس اس کو اپنانے کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ راستہ نہیں تھا۔عربوں کے یہاں کہاوت ہے ’’حکمرانوں کی زبان زبانوں کی حکمران ہوتی ہے‘‘ اور یہی ہوا۔انگریزی حکومت میں انگریزی زبان سب سے زیادہ اہمیت اختیار کرگئی اور باقی زبانیں اپنی اہمیت کھوتی چلی گئیں۔ ہندوستان کی علاقائی زبانوں کو مخصوص علاقوں میں پناہ مل گئی، کچھ مذہب سے جوڑ کر مذہبی خانوں میں جبر دستی رکھ دی گئیں خیر اس طرح کچھ زبانوں کو تحفظ مل گیا اور کچھ کو کسی نہ کسی طبقے میں پناہ مل گئی لیکن ایسے میں ان زبانوں کو کوئی پناہ نہیں ملی جو مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان آئیں اور انہیں کے زیر اثر ہندوستان میں پھلیں پھولیں، ایسی زبانیں غیرملکی قرار دے دی گئیں۔آزاد ہندستان میں ایسی زبانوں کو پوری طرح

سے نظرانداز کردیا گیا۔

اب فارسی کی تعلیم صرف مدرسوں میں رہ گئی تھی اوراس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ ہندوستان میں فارسی زبان اگراب تک زندہ ہے تو ان مدرسوں کی بدولت ہی زندہ ہے۔عہد حاضر کواس حوالے سے قحط زدہ دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آج فارسی داں حضرات انگلیوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔اور فارسی داں سے میری مراد فارسی زبان وادب کے ماہرین سے نہیں ہے بلکہ محض زبان و بیان اور ترسیل و اظہار پر دسترس رکھنے کے عام مفہوم سے ہے۔اس معیار کے افراد بھی محض ''بقدر شمار از انگشت'' ہیں۔

اس مختصر تحریر میں غالبؔ کی فارسی شاعری کی خصوصیات کی توضیح یا ان کے فارسی کلام کے حوالے سے ان کی فنی اور فکری تعین قدر و منزلت مقصود نہیں ہے بلکہ مدعا یہ ہے کہ تفہیم غالب کے باب میں ان کے فارسی کلام کو سمجھنا لازمی ہے کیونکہ غالب کا فارسی کلام اردو کلام کے بالمقابل کثیر ہے۔ساتھ ہی اس کی بنیادی وجہ وہ بھی ہے جو مذکور ہو چکی ہے یعنی غالب نے درجہ بندی میں اپنے فارسی کلام کو ترجیح دی اوراس پر فخر کیا۔ہم اگرچہ غالب پر مزید ہزاروں کتابیں لکھ دیں (بے شمار لکھی بھی جا چکی ہیں) اور تحقیق وتنقید پر مبنی مقالے، مضامین اور خصوصی شمارے شائع کرتے رہیں، لیکن اگر غالب کے فکروفن کے سب سے اہم باب اور پہلو سے بے اعتنائی کی جائے تو غالب شناسی اور تفہیم غالب کی عمارت کس طرح پائدار ہوسکتی ہے۔غالبؔ پر ان کے اردو کلام اور اردو مواد کے حوالے سے رو بہ عمل آنے والے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں لیکن ان تحقیقات اور تنقیدات کی اہمیت جزوی ضرور ہے۔ان کی بنیاد پر غالبؔ کے فکروفن کے پہلوؤں کی حد بندی نہیں کی جاسکتی اور نا ہی غالب کی تفہیم کا حق ادا ہوسکتا ہے۔غالبؔ کے فارسی کلام کی متعدد شروحات لکھی گئی ہیں۔ضرورت اس بات

کی ہے کہ غالب کے فارسی کلام کے محاسن، شعری جمالیات، فنی اور فکری خصائص و امتیازات اور اس کی مختلف جہتوں پر گفتگو کی جائے اور اس کی بنیاد پر فارسی شاعری میں ان کی تعین قدر پر توجہ دی جائے۔

بالعموم میری مراد یہ بھی ہے کہ اردو زبان و ادب سے وابستہ ماہرین اور با اختیار حضرات کو فارسی زبان کی تعلیم اور تدریس پر توجہ دینی چاہیے۔ اردو کے کلاسکی ادب کی (جو بنیاد ہے) تفہیم بغیر فارسی زبان کو سمجھے ممکن نہیں ہے۔ اردو ادب براہ راست فارسی شعر و ادب سے متاثر ہے اور یہ اثرات کافی گہرے ہیں۔ اگرچہ یہ مضمون غالب کے فارسی کلام کی تفہیم اور اس کی اہمیت کے حوالے سے ہے لیکن بالعموم اس سے فارسی زبان و ادب کی تفہیم اور اس کی اہمیت ہی مراد ہے۔

غالبؔ کی شخصیت اور غالب کے فن دونوں میں تہہ داری ہے۔ جیسے جیسے ہم غالب کو پڑھتے جاتے ہیں، جانتے جاتے ہیں اور سمجھتے جاتے ہیں ویسے ویسے نئے انکشافات ہوتے جاتے ہیں۔ ان کے فن اور فکر کا کوئی نیا پہلو ہم پر عیاں ہو جاتا ہے۔ غالب کی فارسی شاعری کے ابواب واضح ہوں گے تو ان کی فنی شخصیت اور ان کی شاعری کی کچھ نئی گرہیں کھلیں گے۔ غالب کی تفہیم کے کچھ نئے سلسلے شروع ہوں گے۔ کچھ انکشافات پردۂ راز سے ظاہر ہوں گے۔

غالبؔ کی فارسی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی اور دیگر اصناف شعر پر مشتمل ان کی فارسی شاعری امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔ اس میں موضوعات کا تنوع،، زبان و بیان کی حسن کاری، اسلوب کی انفرادیت، جدت ادا، بذلہ سنجی، عشق کا شدید ترین احساس، تصوف کی فلسفیانہ بصیرت، سماج کا گہرا شعور، عشق اور عقل کی ملمع سازی، سحر انگیزی، پیکر تراشی، شوخی و ظرافت سب کچھ ہے اور سب سے بڑھ کر روایت کی زنجیروں کو توڑ کر مستقبل کی تلاش میں

سرگرداں ہونے کا شعور ہے۔

غالبؔ نے مختلف فارسی کے شعرا سے استفادہ کیا ہے، ان کے تتبع میں شاعری کی ہے اور ان کے اثرات قبول کیے ہیں لیکن اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی فارسی شاعری میں ان کا انفرادی رنگ اور شناخت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ غالب نے کئی فارسی شعرا کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے جن کے تتبع میں انہوں نے شاعری کی ہے اور اثرات قبول کیے ہیں لیکن بیدل، نظیری اور عرفی کی چھاپ گہری ہے۔ غالب نے ابتدا میں بیدل کا تتبع کیا لیکن جلد ان سے منحرف ہو گئے۔ ان کی بعد کی شاعری میں نظیری اور عرفی کا اثر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ قصیدوں میں انوری کے اثرات بھی قبول کیے ہیں۔

غالب کی طبیعت میں شوخی ہے جس کا پرتو ان کی شاعری میں جا بجا بہت واضح طور نظر آتا ہے۔ یہ شوخی اور رندانہ کیفیت شعاری غالب کے یہاں دوسرے اردو شعرا کے مقابلے کہیں زیادہ ہے۔ بذلہ سنجی اور یہ رندانہ آوارگی غالب کی شاعری کی نمایاں ترین خوبی بن کر ابھرتی ہے۔ ایک عجیب شان بے نیازی کا احساس ان کی شاعری میں لفظوں کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ یہ شوخی، رقص بسمل کی لطف اندوزی اور رندانہ بے خودی حافظ شیرازی کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ غالب دنیا کو حیرت کی نگاہوں سے نہیں تکتے وہ اس کے رازہائے سربستہ سے واقف ہیں۔ وہ دنیا کو ایک تماشہ بیں کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور عجیب وغریب انسانوں اور ان کے کارناموں پر خندہ زن ہوتے ہیں:

رازدان خوئے دہرم کردہ اند
خندہ بر داناں و ناداں می زنم

اردو شعر دیکھیے:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب وروز تماشہ مرے آگے

غالب اپنی شاعری اور فن کی وجۂ تخلیق جذبۂ عشق کو بتایا ہے۔ عشق سے تحریک ملتی ہے اور عشق ہی اسے پائدار بناتا ہے۔ فن کو تپا کر اسے کندن بنانے کا کام عشق ہی کرتا ہے:

غالب بقول حضرت حافظ زفیض عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

غالب کے یہاں عشق کا شدید احساس ملتا ہے لیکن اس میں بے چینی اور ہیجان انگیزی نہیں ہے بلکہ ایک ٹھراؤ ہے ایک اطمینان ہے دراصل یہ اطمینان اور نشاط انگیز کیفیت غالب کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ غالب کے یہاں غم میں نشاط کا عنصر شامل ہے۔ ہجر کا انتہائی اذیت ناک کرب غالب کے درج ذیل اشعار میں دیکھیے:

بیا و جوش تمنائے دیدنم بنگر
چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
زمن بہ جرم کنارہ تپیدن کنارہ می کردی
بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر

''مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو'' یہ غالب کا مشہور قول ہے۔ دراصل یہ غالب کے ایک خط کا اقتباس ہے جو انہوں نے مہر علی کے نام لکھا تھا۔ کچھ اسی طرح کا مفہوم غالب نے اپنے ایک فارسی شعر میں بھی ادا کیا ہے:

در دہر فرورفتہ لذت نہ تواں دارد
بر قند نہ بر شہد نشیند مگس را

غالب نے فارسی شعرا کی زمینوں پر بھی غزلیں لکھی ہیں۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ نشانم دادند
شمع کشتند وز خرشید نشانم دادند
رخ کشودند ولب ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگراںم دادند
گہر از تاج گستند و بدانش بستند
ہر چہ بردند بہ پیدا، بہ نہانم دادند

یہ غزل حافظ کی زمین پر لکھی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے دونوں میں مختلف ہے۔ حافظ کا موضوع تصوف ہے اور اس غزل میں بدلتے ہوئے دور اور سماج کی نئی قدروں کی طرف اشارہ ہے۔ سماج کے ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف منتقل ہونے کا اظہار ہے۔ نا آفریدہ عہد کا عرفان ہے جو مستقبل قریب میں وقت کے پس پردہ چھپا ہے لیکن غالب اسے دیکھ لیتے ہیں۔ یہ غالب کے اعلیٰ سماجی شعور اور مستقبل شناسی کا نمونہ ہے۔ غالب نے نشاط کا ایک منفرد تصور دیا ہے جو غم میں ہی پوشیدہ ہے۔ غم کی انتہا اور معراج ہی یہ ہے کہ غم اٹھانے والا اس میں لذت اور نشاط محسوس کرنے لگے۔ غالب کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

غم لذتیست خاص کہ طالب بذوق آں
پنہاں نشاط در زر وپیدا شود ہلاک

غالبؔ کی شاعری میں غم ایک مضبوط اور مقوی احساس کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ غم کا میں لذت اور نشاط کا یہ نمایاں عنصر غالب کی شاعری کا خاصہ ہے:

وداع وصل جداگانہ لذت دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

غالبؔ کی فارسی غزلیں جس طرح دلکش اور عمدہ لب ولہجے کی ہیں، اسی طرح

ان کے قصائد، مثنویاں اور قطعات وغیرہ بھی وسعت افکار، غیر معمولی وسائل اظہار، جدت ادا اور شعری لطافت کا بہترین نمونہ ہیں۔ غالب کے فارسی قصائد کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ مرزا غالب کے فارسی کلیات نظم (مطبوعہ ۱۸۶۳) میں چونسٹھ قصیدے ہیں انہوں نے جو مختلف المراتب شخصیات کے لیے لکھے ہیں۔ مزید سات قصائد انہوں نے کلیات کی طباعت کے بعد کہے گئے ہیں وہ سبد چین اور باغ دودر کے ذریعے منظر عام پر آئے۔ ان کے فارسی قصائد موضوع کے اعتبار سے حمد باری تعالیٰ، نعت و منقبت، مدح ارباب سرمایۂ دولت اور تعریف احباب پر محیط ہیں۔ غالبؔ کے فارسی قصائد فارسی کے عظیم قصیدہ نگاروں مثلاً، عرفی، خاقانی، انوری اور نظیری کے قصائد کے ہم پلہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ غالبؔ نے اپنے قصیدوں میں اپنی فنی بلندی بلکہ برتری کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کو بلبل شیراز وکجا طوطیٔ آمل
تا پایہ بسنجیم نوا سنجیٔ ہم را
بہ فن شعر چہ نسبت بہ من نظریری را
نظیر خود بہ سخن ہم منم سخن کوتاہ
اگر از اکبر شہ بود بہرہ در عرفی
دگر ز شاہجہاں بود مایہ دار کلیم
نہ کمترم ز حریفاں بہ فن شعر وسخن
نہ کمتری ز نیاگاں بخود و خلق عظیم

مذکورہ بالا اشعار میں غالبؔ نے فنکارانہ اظہار انا کے طور پر برتری کا اظہار کیا ہے۔ اس سے قطع نظر غالبؔ ان اساتذہ کا احترام کرتے تھے اور ان کی فنکارانہ خوبیوں کے معترف تھے۔ غالبؔ نے اپنی شاعری میں ان کے اثرات بھی

قبول کیے ہیں۔

غالبؔ کے قصیدہ میں پرشکوہ الفاظ اورنشاط انگیز اسلوب ملتا ہے۔انہوں نے فارسی شعرا کی تقلید کی ہے تاہم اپنی انفرادیت اور مخصوص شناخت بھی قائم کی ہے۔مذہبی قصائد میں تصوف کا بیان اور عشق حقیقی کا پاکیزہ اظہار ملتا ہے۔غالب نے فارسی میں اہم مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں سے ''ابر گہر بار'' اور ''چراغ دیر'' طویل مثنویاں ہیں اوراردوشاعری میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

مجموعی طور پر غالب فارسی کے بڑے شاعر ہیں اوران کو بحیثیت فارسی شاعر بھی سمجھنے اور پڑھنے کی ضرورت ہے۔اس کے لیے فارسی کا جاننا ضروری ہے۔ویسے اردوشاعری بالخصوص کلاسکی سرمایۂ ادب کوسمجھنا اور پڑھنا ہوتو فارسی زبان وادب کو جاننا ناگزیر ہوجاتا ہے۔اس لیے فارسی کی تعلیم پربھی توجہ دینی چاہیے۔اردو کے ساتھ فارسی زبان کولازمی پرچے کے طور پر پڑھایا جانا چاہیے۔کم ازکم جامعات میں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن میں اردو کے طلبہ کو فارسی پڑھائی جانی چاہیے۔اس سے اردوزبان وادب کی بہتر تفہیم کرسکتے ہیں۔ساتھ ہی ایک عالمی زبان کی سیکھنے کا موقع میسر آئے گا جس سے روزگار کے امکانات بھی وسیع ہو سکتے ہیں۔ایک تیسرا فائدہ یہ ہے کہ ہم غالب کی زبان کو پھر سے زندہ کر سکتے ہیں۔بہرحال اس کے لیے ایک لائحۂ عمل تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

غالبؔ بحیثیتِ نثر نگار

مرزا غالبؔ جہاں ایک طرف اردو شاعری میں غالب تھے وہیں دوسری طرف اردو نثر میں انہوں نے اہم کارنامے انجام دئے۔ اردو نثر میں مرزا غالب کے خطوط کے دو مجموعے بہت اہمیت کے حامل ہیں اردو نثر کی طرف غالب نے 1850ء کے بعد ہی توجہ دی۔ اس سے پہلے وہ فارسی میں لکھتے تھے۔ مرزا غالب کے اردو خطوط نے جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی۔

اردو نثر میں ان کے دو خطوط کے مجموعے ہیں ایک "اردوئے معلیٰ" اور دوسرا "عودِ ہندی" کے نام سے شائع ہوا۔ ان دو مجموعوں کے علاوہ جو خطوط ملے انہیں پروفیسر مسعود حسن خان نے "متفرقات غالبؔ" کے نام سے شائع کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر خلیق انجم نے ان کے تمام خطوط کو اپنے حواشی کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کیا۔ اس میں نئے پُرانے سبھی خطوط شامل ہیں۔ "مکاتیبِ غالبؔ" کے نام سے مولانا امتیاز علی عرشی نے وہ سب خط مرتب کئے جو نوابانِ رامپور کے نام سے مرزا غالبؔ نے لکھے تھے۔ یہ غالبؔ کے ادبی مکتوبات نہیں ہیں بلکہ رامپور کے دربار کو بھیجے ہوئے عزیزوں کا درجہ رکھتے ہیں ان میں فنی خوبیاں مشکل سے ہی تلاش کی جاسکتی ہیں۔ غالبؔ کے اردو خطوط کو کئی دوسرے ناموں کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا جاتا رہا ہے جس سے ان کے مکتوب نگاری کے فن کے کچھ امتیازی گوشے سامنے آتے ہیں۔

غالبؔ نے اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی اپنے چند نثری کارنامے یادگار چھوڑے ہیں۔ انھوں نے فارسی نثر میں بھی بہت کچھ لکھا۔ "مہر نیم روز" کی صورت میں بھی محفوظ ہے اور "دستنبو" کی شکل میں بھی جو غدر کے حالات سے متعلق

چودھری امتیاز احمد، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

ہے۔"برہان قاطع"پر تنقید کے دوران ان کے قلم سے بہت سے نثر پارے سامنے آئے۔اپنے دوسرے نگارش ناموں میں بھی وہ اپنے فنی خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں ان سب کو"پنج آہنگ"میں اکٹھا کیا گیا ہے۔جو غالبؔ کی فارسی زبان میں نثری نگارشات کا مجموعہ ہے اور غالبؔ کی زندگی ہی میں اسے مرتب کر کے شائع کروا دیا تھا۔"پنج آہنگ" مجموعے کو اردو میں ترجمہ کر کے "اوراق معنی" کے نام سے ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اردو اکیڈمی دہلی سے شائع کرایا ہے غالبؔ کا دوسرا مجموعہ جو غالبؔ صدی کے موقع پر غالبؔ کے نو دریافت خطوط کی صورت میں "نامہ ہائے غالبؔ" کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا اسے علی اکبر ترمذی صاحب نے مرتب کیا تھا۔اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اسے "نقشِ نیم رخ" کے نام سے پیش کیا ہے جو غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوا ہے۔"معاصر غالبؔ" کے نام سے غالبؔ کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی حال ہی میں شائع ہوا ہے اس مجموعے میں اور "نامہ ہائے غالبؔ"میں چند خطوط مشترک ہیں پھر بھی یہ ایک جداگانہ مجموعہ ہے یہ خطوط غالبؔ نے اپنے عزیزوں اور قریبی لوگوں کے نام لکھے ہیں ان کا حال معلوم نہیں مگر چند خطوط ایسے ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ مرزا احمد بیگ تپاں کو لکھے گئے ہیں جن سے غالبؔ خلوصِ خاطر رکھتے تھے اور اپنائیت کے رشتوں کے ساتھ ان کو یاد کرتے تھے مرزا احمد بیگ تپاں کلکتہ میں رہتے تھے۔دہلی یا اس کے قرب و جوار میں رہنے والے تھے اور شائستہ مزاج شخص تھے۔

مرزا غالبؔ نے اردو میں چند کتابوں پر تقریظیں اور دو چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں ان کی زبان مصنوعی اور پیچیدہ ہے اس لئے ان کی کوئی اہمیت نہیں لیکن اردو میں جو ان کے خطوط ہیں وہ اردو نثر کی ترقی کے لئے بہت معاون ثابت ہوئے۔خواجہ احمد فاروقی ان کے خطوط کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"حاکم بدہن اگر دیوانِ غالبؔ نہ ہوتا اور صرف خطوطِ
غالبؔ ہوتے تو بھی غالبؔ غالبؔ ہی رہتے۔"

بلا شبہ غالبؔ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے نثر نگار بھی تھے۔ اردو زبان جس رنگ میں ہم تک پہنچی ہے اس میں تین بزرگوں کا خونِ جگر شامل ہے وہ تین بزرگ میر امن، مرزا غالبؔ، اور سر سید احمد خاں ہیں۔ میر امن نے عام بول چال کی زبان کو ادبی رنگ عطا کیا۔ غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعے اردو زبان کو وسعت بخشی۔ غالبؔ نے یہ ثابت کر دیا کہ سادہ نگاری کے اسلوب میں ہزار بناؤ سنگار بھی نثار کئے جا سکتے ہیں۔ سر سید نے مضمون نگاری کے ذریعہ سے اپنی دوسری تخلیقات کے ذریعہ اردو کو عالمانہ وقار بخشا کچھ لوگوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اگر غالبؔ کے خطوط نہ ہوتے تو سر سید کے مضامین بھی نہ ہوتے۔ بہر حال اس دعوے کو نظر انداز کر کے بھی ہم خطوطِ غالبؔ کی انفرادیت اور ان کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔

مرزا غالبؔ کے خطوط ہی ان کی نثر نگاری کا سرمایہ ہیں اور ان خطوط کے ذریعہ غالبؔ نے اردو نثر میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ ابتدا میں جب انہوں نے خطوط لکھنے شروع کئے تب وہ اپنے خطوط کو چھپوانے سے گھبراتے بھی تھے انہیں لگتا تھا کہ یہ تو عام باتوں کی طرح ہیں کوئی خط بھی قلم سے بھاگ کر نہیں لکھا گیا۔ جب مرزا غالبؔ کو اس بات کا علم ہوا کہ ان کی سادہ اور بے تکلف زبان سے آراستہ خطوط بہت پسند کئے جا رہے ہیں تو انہوں نے اپنی نیم شعوری کاوش کو اپنی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی شعوری کوشش میں بدل دیا۔ عہدِ غالب میں فارسی میں خط لکھنے کا رواج تھا خود غالبؔ پہلے فارسی میں لکھا کرتے تھے لیکن کچھ مصروفیت اور خرابی صحت کے سبب وہ اردو میں قلم برداشتہ لکھنے لگے۔ بغیر تیاری کے

جو ذہن میں آتا گیا لکھتے رہے یہ انداز اتنا پسند کیا گیا کہ غالبؔ کو مجبوراً مکتوب نویسی کے لئے فارسی کی جگہ اردو کو اپنانا پڑا۔ خط و کتابت کا انہیں بے حد شوق تھا خود غالبؔ کے بیان کے مطابق ان کے دن کا زیادہ حصہ خط پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا تھا۔ اگر کوئی جواب نہ دے یا جواب میں دیر کرے تو انہیں بہت ناگوار گزرتا تھا۔ غالبؔ کے خطوط پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں مرزا غالبؔ خود اپنی خطوط نگاری کے متعلق بڑے فخر سے لکھتے ہیں:۔

"میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا
دیا ہے سو کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں
وصال کے مزے لیا کرو۔"

بلا شبہ ان کے خطوط کی زبان رسمی نہیں بلکہ آپسی گفتگو میں استعمال ہونے والی زبان ہے لیکن سارے خطوط کی زبان ایک جیسی نہیں ہے انہوں نے جو خطوط بے تکلف اپنے دوستوں کو لکھئے ہیں ان میں ایسی زبان استعمال کی گئی ہے جو آپسی بات چیت کا سا انداز رکھتی ہے۔

غالبؔ کا انداز نرالا تھا کسی کی راہ پر چلنا باعث شرم خیال کرتے تھے وہ اپنا راستہ خود نکالتے تھے اور ایسا راستہ جو سب سے الگ ہو یعنی اس کی انفرادیت نظر آتی ہو اس زمانے میں مکتوب نگاری کا جو انداز تھا اسے غالبؔ نے رد کر کے نیا انداز ایجاد کیا مثلاً اس دور میں لمبے لمبے القاب و آداب کا رواج تھا غالبؔ نے مختصر القاب سے کام لیا جیسے مہاراج، بھائی صاحب، میری جان، بندہ پرور، کیوں صاحب، قبلہ و کعبہ، جانِ غالب، برخوردار کبھی کبھار تو نام لے کر ہی خط شروع کر دیتے تھے۔ جیسے ؎

"یوسف مرزا تجھ کو کیونکر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔"

"میاں لڑکے کہاں پھر رہے ہو آؤ بیٹھو۔"

"ارے کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلا ئیو، لو صاحب
وہ آئے۔"

کبھی کبھار ایسا بھی کرتے تھے کہ سرے سے القاب نہیں لکھتے خط شروع کر دیتے ہیں ایک دو خطوط میں تو اپنا نام بھی نہیں لکھا صرف اتنا لکھ دیا۔

"ہم اپنا نام نہیں لکھتے۔ دیکھیں تو پہچان جاتے ہو کہ
نہیں۔"

دستور تو یہ رہا ہے کہ خط کے ذریعے اگر کسی کو سلام دعا پہنچانا ہو تو خط کے آخر میں لکھا جاتا ہے لیکن غالؔب نے اس قید کی پرواہ نہیں کی ایک خط یوں شروع کرتے ہیں۔

"سب سے پہلے میر سرفراز حسین کو میرا سلام پہنچے۔"

ایک اور خط دیکھیں۔

"میر سرفراز حسین کو میری طرف سے گلے لگانا اور پیار
کرنا میر نصیر الدین کو دعا اور شفیع احمد صاحب کو سلام
کہنا، میرن صاحب کو نہ سلام نہ دعا بس یہ خط پڑھا
دو۔"

انداز دیکھیں کہ " نہ سلام نہ دعا بس یہ خط پڑھا دو" ہزار دعا سلام سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس جملے کے ایک ایک لفظ میں جو پیار ہے وہ سلام دعا سے بھی بڑھ کر ہے۔

یہی معاملہ تاریخ کا ہے جہاں چاہتے تھے تاریخ لکھ دیتے تھے کبھی ابتدا میں کبھی درمیان میں اور کبھی آخر میں لکھتے تھے غرض انہوں نے عام روش سے ہٹ کر لکھا ان کا مزاج دنیا سے الگ اور بالکل نرالا تھا۔ ایک خط میں لکھا ہے اور سچ لکھا

ہے۔

"بھائی میں اپنے مزاج سے لاچار ہوں۔"

غالبؔ کے خطوط عبارت آرائی، بے جا لفاظی، حد سے زیادہ تصنع اور بناوٹ سے پاک تھے۔ ان کا اردو نثر پہ یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے عیبوں کا خاتمہ کیا اور عام بول چال کی زبان سے کام لیا غالبؔ نے اپنے خطوط میں بات چیت کا انداز اختیار کیا۔ کئی خطوط میں لکھا ہے کہ یہ خط و کتابت نہیں بے تکلف بات چیت ہے انداز ملاحظہ ہو:۔

"میاں لڑکے! کہاں پھر رہے ہو؟ ادھر آؤ خبریں سنو۔"

"آؤ میرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ، بیٹھو اور میری حقیقت سنو، کیوں یار کیا کہتے ہو؟ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں۔"

"ہاہاہا میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔"

ان کے خطوط میں اپنے عہد کی سچی تصویر کشی ملتی ہے۔ 1857ء کی ناکام بغاوت کا انداز ان کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے ان خطوط میں غدر کے ہنگاموں کے تمام حادثات اور المناک مناظر کی سچی ترجمانی ملتی ہے ایک خط میں بے اطمنانی کا اظہار کیا ہے۔ دیکھئے:۔

"اس وقت تک مع اہل و عیال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں قلم ہاتھ میں لئے پر لکھنے کو جی چاہتا ہے پر لکھ نہیں سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہانی

کہی جائے گی ورنہ اناللہ وانا الیہ راجعون ۔"

دلی شہر کی بربادی پر لکھتے ہیں:۔

"اے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا اردو کہاں دہلی کہاں واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے، چھاونی ہے، نہ قلعہ نہ شہر، نہ بازار نہ نہر۔"

خطوطِ غالبؔ کی ایک اہم خصوصیت شوخی وظرافت ہے یہی وجہ ہے کہ حالؔی نے انہیں حیوانِ ظریف کہا ہے اپنے گھر کی خستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے کہیں لگن دھرا ہے تو کہیں چلمچی، خط لکھوں تو کہاں بیٹھ کر۔"

غالبؔ نے ایک مرتبہ اپنی موت کی پیشین گوئی بھی ازراہِ ظرافت کی تھی۔ ایک دوست نے تفریحاً لکھا کہ اس سال وبا بھی پھیلی مگر آپ سلامت رہے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"میاں 1277ھ کی بات غلط نہ تھی ۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"لوگ روٹی کھاتے ہیں میں کپڑا کھاتا ہوں۔"

غالبؔ کی یہ کوشش رہتی ہے کہ خط میں کوئی ایسی بات ضرور لکھی جائے جس سے مکتوب الیہ خوش ہو۔ کسی نے غالبؔ سے یہ شکایت کی کہ آپ روزہ نہیں رکھتے جواب کچھ یوں دیا:۔

"دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا
رہتا ہوں کبھی ایک کٹوری پانی پی لیا، کبھی حقے کا کش لگا
لیا، کبھی روٹی کا ٹکڑا کھا لیا۔"

غالبؔ اپنے ایک دوست کی تیسری بیوی کے انتقال کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اللہ اللہ ایک وہ لوگ ہیں کہ تین تین دفعہ اس قید سے
چھوٹ چکے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اگلے پچاس
برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی
ٹوٹتا ہے اور نہ دم ہی نکلتا ہے۔"

غالبؔ کا یہ انداز اپنی انفرادیت رکھتا ہے کیوں کہ یہاں عام روش کے مطابق غم کا اظہار کیا جاتا لیکن غالبؔ نے وہ انداز اپنایا کہ غم کو بھی خوشی کا جامہ پہنایا۔

غالبؔ کے خطوط کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ عہد غالبؔ کی دلی کی سچی تصویر ان میں نظر آتی ہے 1857 میں جب دلی اُجڑی ہزاروں گھر برباد ہوئے اس ہنگامے میں بیشمار لوگ مارے گئے جن میں بعض ہندوستانی اور بعض انگریز تھے۔ غالبؔ ان دونوں کے غم میں برابر شریک نظر آتے ہیں یہاں بھی وہ انسان دوستی دکھاتے ہیں۔ مثال دیکھیں۔

"انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ
سے قتل ہوئے ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا
شفیق، اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا
شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ
معشوق، سب کے سب خاک میں مل گئے ایک عزیز کا
ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو

زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ
اب جو میں مروں گا تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ
ہوگا۔''

خطوط غالبؔ میں جہاں افسانوی اور ڈرامائی انداز ملتا ہے تو وہاں خالص علمی زبان کے نمونے بھی ملتے ہیں علمی نثر کا ایک پہلو استدلالی انداز بیان ہے غالبؔ کے خطوط میں اس کے نقوش مل جاتے ہیں۔ ایک مثال امین الدین خان کے نام سے ایک خط سے ۔

''آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے
باب میں تم کو کیا لکھوں ؟ تعزیت کے واسطے تین
باتیں ہیں اظہارِ غم ،تلقینِ صبر، دعائے مغفرت سو
بھائی اظہارِ غم تکلف محض ہے جو غم تم کو ہوا ہے ممکن
نہیں کہ وہ دوسرے کو ہوا ہو تلقینِ صبر بے دردی ہے
یہ سانحہ عظیم ایسا ہے جس نے غم رحلت نواب کو تازہ کیا
پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی
دعائے مغفرت میں کیا میری دعا کیا مگر چونکہ وہ میری
مربیہ اور محسنہ تھیں دل سے دعا نکلتی ہے۔''

غالبؔ کے خطوط کو ان کی سوانح کہا جا سکتا ہے ان کی حیات اور خاندان کی تمام باتیں ان خطوط میں موجود ہیں ان کی زندگی ایک المیہ تھی بچپن میں ہی والد کا اور چچا کا انتقال ہو گیا عمر بھر تنگدستی رہی لیکن سخاوت اور دریا دلی کی فطرت تھی سائل ان کے دروازے سے کبھی خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ غالبؔ کی پنشن کا ذکر بھی ان کے خطوط میں ملتا ہے شراب نوشی کا بیان جوا کھیلنے اور اس جُرم میں جیل جانے کا ذکر بھی

ان خطوط میں پایا جاتا ہے۔ غالبؔ کے خطوط ان کے دوست احباب ادبی مجالس اوران کی شاعری سبھی کا آئینہ ہیں غالبؔ کواگرچہ زندگی میں بیشمار مشکلات سے سابقہ پڑا لیکن ان کی شوخ طبیعت نے ان مشکلات کو غالبؔ پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

خطوط غالبؔ کے اسالیب کے اعتبار سے انہیں جدید اردو نثر کا سرچشمہ کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا۔ غالبؔ کے خطوط ان کی دلچسپی کا ثبوت ہیں ان کے اپنے بیان کے مطابق ۔

"میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں
یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا خدا
کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا ہے جو اطراف و
جوانب سے دو چار خط نہیں آرہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن
ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو
صبح کو ایک دو شام کو میری دل لگی ہو جاتی ہے دن ان کے
پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔"

غالبؔ کے خطوط کی گوناگوں خصوصیات اردو نثر کی اہمیت کو دوبالا کرتی ہیں عصری مسائل، پُرسکون فلسفہ زندگی اور اندازِ تحریر کی شگفتگی نے انہیں حیاتِ جاوید بخشی۔ جذبات نگاری اور ڈرامائی عناصر نے اردو ناول کے لئے راہ ہموار کی انہوں نے اپنے خطوط میں وہ انداز اختیار کیا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو زبان میں علمی و تاریخی حقائق کا وسیلہ اظہار بننے کی صلاحیت موجود ہے غرض غالبؔ کی شاعری کے علاوہ اگر ان کی نثری تصانیف کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالبؔ نثر میں بھی غالب ہی رہے۔

’کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور‘

مرزا غالبؔ کے اس مصرع سے ہی ظاہر ہے کہ یہ اپنے اندر کتنی وضاحت لئے ہوئے ہے۔ سطحی طور پر اگر اس مصرع کو پڑھیں تو فوراً ہمارا ذہن ان کی غزلوں کی طرف رجوع ہو جاتا ہے کہ یہ مصرع انھوں نے اپنی غزل کے بارے میں کہا ہے کیونکہ یہ صنف غزل کا مصرع ہے اور ان کے شعری کلام میں غزلیں زیادہ شامل ہیں لیکن یہ غلط ہے کیونکہ انھوں نے اس شعر کے مصرع اولیٰ میں سخنور کی بات کی ہے نہ کہ غزل گو کی اور موجودہ مصرع میں بھی انھوں نے انداز بیاں کی بات کی ہے نہ کہ مخصوص غزل گوئی کی۔ اس طرح اس مصرع میں بہت گہرائی و گیرائی پوشیدہ ہے غالبؔ نے جس بھی صنف میں طبع آزمائی کی ہے چاہے وہ غزل ہو، قصیدہ ہو، خطوط ہو، رباعی ہو یا قطعہ ہو اس میں انھوں نے اپنا منفرد مقام قائم کیا جس کا انھیں خود احساس تھا اور اپنی غزل کے اس ایک مصرع میں انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے اور یہی تو غالبؔ کے مظاہرہ کا دلکش انداز ہے۔ اس مصرع کے پیش نظر ہم کو ان کے شعری اور نثری تمام کارناموں پر نظر ڈالنی چاہئے تبھی ان کے اس مصرع کے ساتھ انصاف کرنے میں مکمل نہیں تو کچھ حد تک کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

اردو غزل کی دنیا میں غالب انیسویں صدیؔ کا وہ کلاسیکی شاعر ہے جس نے غزل کو مروجہ پیچیدہ روایت اور سطحی جذباتیت کے تنگ دائروں سے باہر نکال کر کھلی ہوا میں سانس لینا سکھایا۔ وہ ایک فلسفیانہ نظر رکھتے ہیں۔ غالبؔ کے منطقی اور استدلالی انداز بیان کے بارے میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

> ”غالب صرف جذبات کا تجزیہ ہی نہیں کرتے بلکہ
> ان میں باہمی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شاذیہ غلام انصاری، سابق طالبہ، حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، پریاگ راج

محبت ان کے لئے کوئی ایسا جذبہ نہیں جو فطری طریقے
سے دلکش محاکات میں ڈھل جائے بلکہ یہ ایک گرم تیز رو
ہے جو پوری شخصیت کے اندر انقلاب پیدا کر دیتی ہے
غالب صرف اشاروں سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنے نرم و
لطیف، احساسات و کیفیات کا تجزیہ کرتے اور ان پر
استدلال کرتے ہیں۔"

عشق ایک آفاقی موضوع ہے اور اردو شاعری میں تو اس موضوع کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ غالبؔ کے یہاں اس وسیع موضوع کو مختلف شکلوں میں پیش کیا گیا ہے اور عاشق و معشوق کے درمیان مختلف شکوہ و شکایتوں، وفا و بے وفائی کے پہلوؤں کو نہایت ہی فنکارانہ انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔ مثلاً:

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اِس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

کہیں پہ وہ شوخی سے کام لیتے ہیں اور محبوب کے حسن اور خوبصورتی پر غائرانہ ڈالتے ہوئے اپنے معشوق کو ماہ کامل پر ترجیح دیتے ہوئے مہ خورشید جمال قرار دیتے ہیں۔ ان کے یہاں معشوق مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پُر افشاں جوہر آئینے میں مثل ذرّہ روزن میں

☆☆☆

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

کبھی معشوق کو بے وفا کہتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

اورخود ہی اپنے معشوق کوحق شناس بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جس کا دل حق شناس ہوتا ہے وہ باوفا بھی ہوتا ہے اس لئے میرا معشوق جب حق شناس ہے تو اسے وفادار بھی ہونا چاہئے اور وہ وفادار ہے بھی لیکن دراصل وہ اتنا حسین ہے کہ اس کی آنکھوں پرغرورحسن کا پردہ ہے اس لئے حق شناس دل رکھنے کے باوجود وہ عاشق کی وفا کو پہچان نہیں پا رہا ہے اوراس سے بےوفائی روا رکھے ہے۔ مثلاً:

ہے وہ غرور حسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اس کے پاس دل حق شناس ہے

☆☆☆

ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

اس سے بھی آگے بڑھ کر غالب نے ایک اور نکتہ یہ نکالا ہے کہ میں ہی صرف وہ بد بخت نہیں ہوں جو معشوق کے عشق میں گرفتار ہوں اور درد عشق میں مبتلا ہوں بلکہ معشوق خود کسی کے عشق میں گرفتار ہے۔ معشوق کا خود عاشق ہونا غالبؔ نے اپنے شعری پیرائے میں بڑے ہی دلکش انداز میں باندھا ہے۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات کیجئے

☆☆☆

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوے دوست دشمن کو

☆☆☆

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد یاں

غالبؔ کسی بھی مضمون کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی شاعری میں خیالات اور جذبات کے ساتھ فکر بھی رواں دواں نظر آتی ہے۔ غالبؔ نے عشق و عاشقی کے موضوعات کے علاوہ سیاسی، تہذیبی، معاشرتی موضوعات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ ۱۸۵۷ء کی خوں چکاں حکایتیں اور ہنگامی حالات ان کی نظروں کے سامنے تھے چونکہ انسانی نفسیات کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ انسان جن حالات کا شکار ہوتا ہے اس کے اثرات اس کی شخصیت پر ظاہر ہونے لگتے ہیں اور پھر شاعر کا دل تو نہایت ہی حساس ہوتا ہے اس لئے ان کی زندگی کے ناسازگار حالات نے انھیں مردہ دل بنا دیا تھا۔ ان کی مردہ دلی اور محرومی کی نشاندہی ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے محسوس کی جا سکتی ہے۔

جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

☆☆☆

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

☆☆☆

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

ان اشعار کو پڑھ کر ہمیں اپنی فکر کو ان کی محرومیت اور مردہ دلی تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہئے کیونکہ یہ تو ان کے کلام پر اس عہد کے تاثر تھے۔ سارے حادثات کا سامنا کرتے ہوئے اور ساری محرومیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انھوں نے اپنے مردہ دل میں بھی زندہ دلی کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔

غم نہیں آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں شمع روشن ماتم خانہ ہم

ہے آدمی بجائے خود ایک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا ہے کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

اس طرح غالبؔ اپنی زندہ دلی کے سبب اپنے ویران خانہ پر بجلی گرنے کو اس کے روشن ہونے کا ذریعہ بتاتے ہیں اور خلوت میں بھی اپنی فکر کے ہجوم کو ایک انجمن خیال کرتے ہیں اور دردِ داغ کے سرمایہ کو دھواں کے وجود سے زیادہ اور کچھ خیال نہیں کرتے جس کا وجود خود اپنے آپ میں چند پل کا ہوتا ہے۔

مرزا غالبؔ کی شاعری میں گہرے فکر و فلسفے کی کارفرمائی ہے۔ ان کے یہاں کوئی مخصوص اور باضابطہ فکری نظام نہیں پایا جاتا ہے لیکن پھر بھی غالبؔ کے پورے کلام میں ان کے فلسفیانہ خیالات جابجا نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کی غزلوں میں درج ذیل اشعار کے ذریعہ ان کی شاعری کے فلسفیانہ پہلو سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔

آ گہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ
لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر

غالب نے اپنی غزلوں میں اس مضمون کو بعض جگہ بیان کیا ہے کہ وہ قید ہیں، اجنبی ماحول میں ہیں۔ کہیں انھوں نے استعارے کے پردے میں یہ بات کہی ہے تو کہیں براہ راست۔ مثلاً

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
میرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

حالی نے غالب کو حیوان ظریف کہا ہے کیونکہ وہ ظریفانہ طبیعت کے مالک تھے اور انھوں نے اپنی شاعری میں طنز وظرافت کے پہلو کو بھی نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ اپنی غزلوں میں انھوں نے رمزیہ اور طنزیہ انداز سے جو حسن پیدا کیا ہے، وہ ان کی تخلیقی ہنر مندی کی دلیل ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

غالب بُرا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا جسے کہیں

واعظ پر طنز کرتے ہوئے غالب فرمار ہے ہیں کہ اے غالب اگر واعظ تجھے

بُرا بھلا کہہ رہا ہے تو اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اس دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جسے سب اچھا کہیں تو واعظ بھی اسی دنیا کا فرد ہے تو وہ کیسے بچ سکتا ہے۔اس طرح تجھے برا بھلا کہنے والے واعظ کو بھی سب ہی اچھا نہیں کہتے۔

دوسری مثال دیکھئے:

جلاد سے لڑتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

اس شعر کے لطیف معنی یہ ہیں کہ غالبؔ طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر کسی بھیس کا جادو نہیں چل سکتا چاہے وہ جلاد ہو چاہے واعظ۔جلاد اس دنیا میں برے کام کی سزا دینے کے لئے ہوتا ہے اور واعظ آخرت کی سزا کے لئے ڈراتا ہے۔

بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

یہ شعر ہر صورت میں انسانی صورت حال کا مذاق اڑاتا ہوا اور انسان کی مجبوری کو تفنن کے لہجے میں بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ غالبؔ زندگی کے ایک بہت ہی اہم پہلو عمر کی تیز رفتاری اور اس کے متعلق اپنی محتاجی کو اس انداز میں بڑی شوخی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

رفتار عمر قطع رہ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

☆☆☆

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

شاعری میں معاملہ بندی میں مومنؔ کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے لیکن

غالبؔ کی معاملہ بندی کہیں کہیں مومنؔ کی معاملہ بندی پر سبقت لے جاتی ہے۔ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں جن میں استعاراتی الفاظ کولغوی معنی میں بھی فرض کرنے کی گنجائش رکھ دی ہے اوراس طرح نئے معنی کے امکانات پیدا کر دیے ہیں۔مثلاً:

تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

اردوشاعری میں صنم پرست اور بت عاشق ومعشوق کا استعارہ ہیں لیکن مذکورہ شعر میں دونوں ہی لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہے یعنی بتوں کے پوجنے والے کا بتوں پرکوئی اثرنہیں ہوتا وہ تو صنم پرستوں کی آہ سےنہیں پگھلتے اور نہ ہی صنم پرست اس بات کی کوئی شکایت اپنے بتوں سے کرتے ہیں تو جب میں بت ہوں اورتم صنم پرست ہو یعنی بتوں کو پوجنے والے تو میرے اوپر تمہاری آہ کا اثر کیونکر ہواور تم کواس بات کی کوئی شکایت بھی نہیں ہونا چاہئے۔

ایک نہایت ہی فلسفیانہ اورقول محال شعر میں انھوں نے اپنے تخلص کولغوی معنی میں استعمال کیا ہے۔مثلاً:

لوں دام بخت خفتہ سے یک خواب خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

کہتے ہیں کہ آشفتگی اوراضطراب کے سبب نیندنہیں آتی اس لئے سوچتا ہوں اپنی سوئی ہوئی قسمت سے ایک خوش خواب (نیند) ادھار مانگ لوں لیکن یہ خوف غالب (بہ معنی حاوی) ہے کہ اگراس خوش خواب کوادھار لے لوں گا تو اس کوادا کیسے کروں گا چونکہ جو چیز بطورقرض لی جاتی ہے اس کا ادا کرنالازمی ہوتا ہےاور چونکہ مجھے نیندنہیں آرہی ہےاوراگر مانگ کرنیند لےلوں تو سوجاؤں گا تب مستعار نیندکوادا کیسے

کرسکوں گا۔

غالبؔ کی شاعری کا ایک نمایاں وصف ان کے معنی کی مختلف سطحیں ہیں ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی کافی تعداد میں موجود ہیں جنھیں ظاہری طور پر پڑھنے سے ان کے ایک معنی واضح ہوتے ہیں لیکن اسی شعر کو بغور پڑھنے سے ان سے مختلف معنی ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً:

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

☆☆☆

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

☆☆☆

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

غالبؔ نے چونکہ فارسی میں بھی کافی شاعری کی ہےاور فارسی شاعری میں تصوف کی روایت کی موجودگی ہے۔ اس لئے باضابطہ صوفی شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی غالبؔ کی شاعری میں بعض مقامات پر تصوف کے عناصر ملتے ہیں۔ ان کے یہاں تصوفانہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

☆☆☆

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

☆☆☆

بخشے ہے جلوۂ گل، ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

غالبؔ کی شخصیت میں انا اور خودداری کو بھی خاص مقام حاصل ہے جس کا مظاہرہ انھوں نے اپنے کلام میں جا بجا کیا ہے۔ یہاں اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

شاعری کے میدان میں غزلوں کے علاوہ غالبؔ نے اردو میں ایک مثنوی، چار قصیدے اور چند قطعات و رباعیات بھی لکھی ہیں۔ قصیدہ نگاری میں بھی وہ اپنی طرز خاص کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہیں۔ ان کی تشبیب دل آویز، گریز فطری اور پُرکشش ہوتی ہے۔ مدح گوئی میں وہ حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ الفاظ کی ترتیب اور لب و لہجے کی بے ساختگی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بات کر رہا ہے اُن میں مکالمہ کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہر عالم تاب کا منظر کھلا

☆☆☆

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاش کہ ہوتا قفس کا در کھلا

اس طرح شاعری میں تو غالبؔ کا منفرد مقام ہے ہی لیکن نثر میں بھی آپ کی حیثیت کسی طور کچھ کم نہیں ہے۔ ان کی نثر نگاری کا آغاز فارسی سے ہوا لیکن اردو میں بھی ان کے رسالے، کتابوں پر دیباچے، تقریظیں اور کچھ متفرق تحریریں بھی ملتی ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا نثری کارنامہ ان کے خطوط ہیں۔ ان کے خطوط میں جدید نثر کے

بنیادی خدوخال واضح نظر آتے ہیں۔ بقول حالؔی:

''مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریق فی الواقع سب
سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت
میں اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری
پوری تقلید ہوسکی۔''

اپنے خطوط نویسی کے ذریعہ غالبؔ نے ایک نیا انداز، نئی فکر، نیا خیال، نیا آہنگ، نئی طرز اور نیا اسلوب اردو نثر میں ایجاد کیا۔ غالبؔ کے خطوط میں مراسلے مکالماتی انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ روایتی القاب وآداب میں تھوڑا ردو بدل کرتے ہوئے مکتوب الیہ کی شخصیت کے مطابق القاب استعمال کرتے ہوئے انھوں نے اپنے خطوط میں براہ راست مکالمہ کا انداز اختیار کیا۔ مثلاً:

'' آؤ مرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ بیٹھو اور میری
حقیقت سنو۔''

۱۸۵۷ء کی عالمی جنگ کا نقشہ بھی غالبؔ نے اپنے خطوط میں واضح طور پر اجاگر کیا ہے اور چونکہ ظریفانہ طبیعت کے مالک تھے اس لئے شاعری کی طرح ان کے خطوط میں بھی ظریفانہ عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ مثلاً امراؤ سنگھ کی اہلیہ کے انتقال پر غالبؔ کی بذلہ سنجی کا رنگ دیکھئے:

''امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور
اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ۔ اللہ ایک وہ
ہیں۔۔۔۔۔۔ نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا
ہے۔''

مرزا غالبؔ کی تحریروں میں گفتگو کا قدرتی آہنگ موجود ہے۔ ان کے

خطوں میں جذبات کے مطابق اتار چڑھاؤ، جوش اور ہمواری، غم اور خوشی، بے چینی اور سکون پایا جاتا ہے۔ غرض مختلف جذباتی حالتوں کے مطابق ان کی نثر اپنا آہنگ بدلتی ہے۔ مرزا غالبؔ کے خطوط بے جا مبالغہ سے پاک، بے تکلف، بے ساختگی و سادگی، خلوص و صداقت سے پُر ہونے کے سبب اردو نثر کی دنیا میں منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔

غالبؔ ایک ذی شعور فنکار تھے ان کے شعری و نثری کارناموں کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے اور ان کے اسلوب اور آہنگ کو مدنظر رکھتے ہوئے میں اپنے اس مضمون کو غالبؔ کے ہی ان اشعار پر ختم کرنا چاہوں گی۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　　غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے　　　سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بے کراں کے لیے

Special Number
Mirza Ghalib

ISSN 2320-3781

Naqsh-e-Nau

2019-20

International Annual Urdu Journal

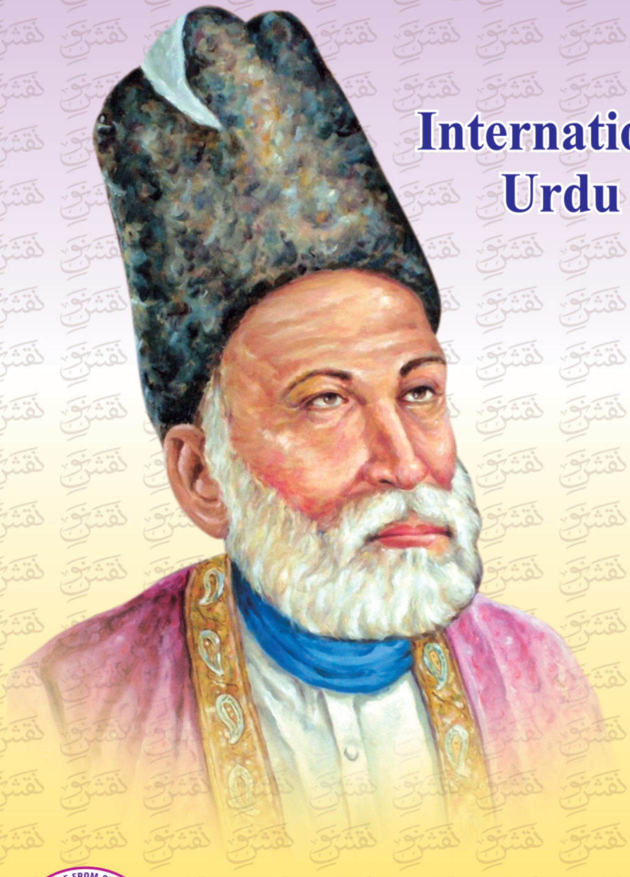

Published by : Dept. of Urdu
Hamidia Girls' Degree College, Prayagraj
University of Allahabad